پرواز

شفیق الرحمن

پرواز

شفیق الرحمٰن

خالد کے نام

فہرست

ایک دفعہ کا ذکر ہے 9

مجبوریاں 33

قصّہ حاتم طائی بے تصویر 52

تُرپ چال 84

تحت الشُعور اور لا شُعور 128

ہدایت نامہ طلباء 146

چاء 165

فنِ لطیف 181

شیطان اور کوہِ ہمالیہ 198

فرماتے ہیں.......................................239
تکیہ کلام 253
شیطان کی خالہ جان 273

ایک دفعہ کا ذکر ہے

نوٹ: اس مضمون میں کوئی کردار یا فرضی واقعہ نہیں ہے۔ اگر کسی نے اپنی طرف منسوب کیا تو مصنّف کو بڑی خوشی ہو گی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی باغ کے ہرے بھرے گوشے میں چند بچّوں کی گاڑیاں یکلخت کہیں سے آ گئیں۔ ہر گاڑی کے ساتھ حسبِ معمول ایک عدد آیا بھی تھی۔ آیاؤں نے گاڑیوں کو ساتھ ساتھ کھڑا کر دیا اور خود باتیں کرنے لگیں۔ گاڑیوں میں نہایت ہی ننّھے مُنّے بچّے بیٹھے ایک دوسرے کو مٹر مٹر دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھار ایک دوسرے کو ہلکا سا اشارہ کر دیتے تھے اور ایک آدھ غاؤں غاؤں بھی ہو جاتی۔ بچّے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ ہر ایک بمشکل سال بھر کا ہو گا۔

آیاؤں کی گفتگو سنجیدہ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد سنجیدہ ترین ہو گئی اور جب سنجیدہ ترین ہوئی تو ایک غدّر مچ گیا۔ ایک آیا نے تجویز پیش کی کہ اسے ڈر ہے کہ اس شور و غل سے تنگ آ کر بچّے کہیں رونے کا شغل شروع نہ کر دیں، لہٰذا بہتر یہی ہو گا کہ

یہ محفل دوسرے پلاٹ میں منعقد ہو۔ تجویز معقول تھی۔ آیائیں وہاں سے چلی گئیں۔ ان کا جانا تھا کہ سب بچّے مسکرانے لگے۔ ایک سنہرے بالوں والا دوسرے سے بولا۔ ”سنایئے قبلہ کیا حال ہے؟“

”آپ بھی غضب کرتے ہیں۔“ دوسرا بچّہ سرگوشیوں میں بولا۔ ”ذرا آہستہ بولیے۔ کسی آیا نے سُن لیا تو شامت آجائے گی۔“

پہلا بچّہ: ”لاحول ولا قوۃ۔۔۔ آیا سے ڈرنے والے اے آسماں نہیں ہم! اوّل تو وہ سب کی سب کافی دُور جاچکی ہیں اور پھر ان بڑوں کو ہماری زبان کہاں سمجھ آتی ہے۔ یہی کہہ دیتے ہیں کہ بچّے بیکار غاؤں میاؤں کر رہے ہیں۔“

دوسرا بچّہ: ”واقعی وہ لوگ کافی دور ہیں۔ اچھا آپ سنایئے کیسی گزر رہی ہے؟“

پہلا بچّہ: ”بس صاحب دن پورے کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے۔ جی بالکل نہیں لگتا۔ بس سمجھ لیجئے کہ

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے

عمر یونہی تمام ہوتی ہے“

دوسرا بچّہ: ''آپ کچھ قنوطی بنتے جا رہے ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا، آج ہماری مجلس میں چند نئے حضرات جلوہ افروز ہیں۔ میرے خیال میں پہلے تعارف ہو پھر محفل جمے گی۔''

پہلا بچّہ: ''ان سے ملئے، ان کا نام ننّھے میاں ہے۔ یہ ایک نہایت شریف الطبع اور معقول بچّے ہیں۔ سلجھی ہوئی طبیعت کے مالک ہیں۔ اور ان کی عمر۔۔۔ میں بھول گیا۔ آپ خود بتا دیجئے، ننّھے میاں!''

ننّھے میاں: ''خاکسار کی عمر گیارہ مہینے گیارہ ماہ اور گیارہ گھنٹے ہے۔ اور جناب کی تعریف!''

ایک نیا بچّہ: ''ناچیز کو چُنّو کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ معاف کیجئے۔ میں ان دونوں حضرات سے پہلے کبھی نہیں ملا!''

پہلا بچّہ: ''یہ مُنّے میاں ہیں اور ساڑھے گیارہ ماہ کے ہیں۔ میں کِڈی ہوں۔ یہ انگریزی نام مجھے بھی پسند نہیں۔ ہمارے ابّا جان کئی سال ولایت میں رہ چکے ہیں اس لیے یہ نام زبردستی گلے منڈھ دیا گیا ہے۔ بندہ اگلے ہفتے ایک سال کا ہو جائے گا۔''

ایک اور بچّہ: ''اور میں راجہ ہوں۔ میں سات مہینے اور سات دن کا ہوں۔''

ننّھے میاں: "معاف کیجئے، حضرت مجھے یہ نام کچھ غیر مانوس سا معلوم ہوا ہے۔ سرکس میں چیتوں اور شیروں کا نام راجہ ہوتا ہے یا پھر اصلی راجہ ہوتے ہیں جن کی رانیاں ہوتی ہیں۔ ایک بچّے کے لیے یہ نام کچھ غیر شاعرانہ سا ہے۔ میرے خیال میں آپ کو فوراً اپنا نام بدلوا لینا چاہیے۔"

راجہ: "مجھے خود احساس ہے لیکن صاحب بے بسی ہے۔ ذرا بڑا ہولوں پھر کچھ کروں گا۔"

کِڈی: "چھوڑیے یہ کیا خشک باتیں لے بیٹھے آپ، مُنّے میاں سنا تھا کہ آپ کے دشمنوں کو نمونیا ہو گیا تھا۔"

مُنّے میاں: "میرے دشمنوں کو نہیں مجھ کو ہو گیا تھا۔ لیکن وہ نمونیہ نہیں تھا، برونکو نمونیہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی تشخیص غلط نکلی۔ اب میں خدا کے فضل اور آپ کی دُعا سے بالکل تندرست ہوں۔ یہ ڈاکٹروں کی تشخیص ہمیشہ ہی غلط نکلتی ہے اور خصوصاً بچّوں کے معاملے میں تو یہ بالکل بے پروا بن جاتے ہیں۔ نا معلوم یہ لوگ ملاحظہ کرتے وقت گُدگُدیاں کیوں کرنے لگتے ہیں۔ جونہی ان کا ہاتھ میرے پیٹ پر آیا۔ مجھے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

کِڈی: ”قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ مجھے بھی ان لوگوں سے ایک شکایت ہے۔ دوا کے ساتھ غذا بتانے میں یہ لوگ انصاف سے کام نہیں لیتے۔ میں نے بارہا گھر میں یہی دیکھا ہے کہ مریض کی غذا کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب نے کھانا کب کھایا تھا۔ اگر ڈاکٹر صاحب ابھی ابھی کھانا کھا کر آئے ہیں تو کہیں گے۔ آپ بالکل ہلکی پھلکی اور دبلی پتلی غذا کھائیے۔ ذرا سا شوربہ اور ایک چھوٹا بسکٹ۔ یا بغیر دودھ اور شکر کی چاء گھونٹ بھر، بس۔ اگر بہت زیادہ بھوک محسوس ہو تو تھوڑا سا پانی پی لیجئے۔ یا ممکن ہے آپ کو فاقہ کشی کا حکم ہی مل جائے اور وہ خود بھوکے ہیں، تو کہیں گے۔ آپ زیادہ وہم نہ کیجئے جو دل چاہے نوش فرمایئے۔ پراٹھے، قیمہ، آلو کا بھُرتہ، شامی کباب، بریانی سب کچھ کھا سکتے ہیں۔ پھل بھی کھایئے۔ اگر جی چاہتا ہے تو تھوڑی سی مٹھائی چکھ لینے میں بھی کوئی ہرج نہیں ہے۔“

مُنّے میاں: ”بھئی کچھ بھی ہو۔ آپ کی خاطر تواضع تو خوب ہوتی ہے۔ میں نے کئی ڈاکٹروں کو آپ کی تعریف کرتے سُنا ہے کہ آپ شہر کے خوبصورت ترین بچّوں میں سے ہیں۔“

کِڈی: (شرما کر) ”ذرّہ نوازی ہے، عنایت ہے ورنہ بندہ کس لائق ہے۔ لیکن وہ کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ۔

اچھی صورت بھی کیا بُری شے ہے

جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی

مجھے بہن بھائی، امّی، ابّا، اپنے پرائے، سب اس بُری طرح پیار کرتے ہیں کہ تنگ آجاتا ہوں۔ یہ ہر وقت کا لاڈ مجھے پسند نہیں۔ مصیبت تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں کئی حضرات کی خوب گھنی اور خونخوار مونچھیں ہیں۔ ایک دو بزرگ صاحبِ داڑھی بھی ہیں۔ جب وہ پیار کرتے ہیں تو چہرہ چھِل جاتا ہے۔ اور پھر امّی تو ہر وقت چومتی رہتی ہیں۔ سوتے سوتے جگا دیا جاتا ہوں۔ ان لوگوں کو غالباً یہ بھی علم نہیں کہ چومنا بھی طبّی نکتہٴ نگاہ سے ایک خطرناک حرکت ہے۔ یہ لوگ جراثیم وغیرہ کی تھیوری سے ناواقف ہیں!"

چُنّو: "کل انگوٹھا چوستے چوستے میں دیر تک سوچتا رہا کہ یہ کم بخت دانت کب نکلیں گے۔ انتظار کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ دانت نکلتے ہی سب سے پہلے آپا کی انگلی میں کاٹ کھاؤں گا۔ وہ دن میں کئی کئی مرتبہ زبردستی میرا مُنہ دھوتی ہیں۔ دانت نکلتے ہی میں غالباً پلاؤ تو کھا سکوں گا۔ کیوں؟"

راجہ: "میرے خیال میں نہیں، کیونکہ دانتوں کا مکمل سیٹ ذرا دیر میں آئے گا۔ ایک دو دانتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔"

کِڈی: ”اجی پلاؤ تو بالکل ملائم چیز ہے۔ آپ بھنا ہوا مرغ بھی دو دانتوں سے کھا سکیں گئے۔ انسان کی قوتِ ارادی مضبوط ہونی چاہیے۔ ع ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ بھئی ننّھے میاں آپ خاموش ہیں۔“

ننّھے میاں: ”حضرت کیا عرض کروں۔ مدّتوں سے میں سوچ رہا ہوں کہ آخر یہ لوگ بچپن کو ساری عمر کیوں یاد کرتے ہیں۔ آخر کیا نرالی چیز ہے اس میں۔ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔ اب ہمیں ہی لیجئے، خود کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ جس کا دل چاہے آکر دھمکا جائے، گُدگُدیاں کرنے لگے، گود میں اُٹھا کر بھاگ جائے اور گود لینا بھی تو کسی کو نہیں آتا۔ اچھالتے ہیں، جھٹک دیتے ہیں۔“

کِڈی: ”لیکن آپ نے ان کی حرکتوں پر بھی غور فرمایا۔ ہمیں دیکھ کر کیسی کیسی شکلیں بناتے ہیں۔ کیسی کیسی آوازیں نکالتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ عقلمند سے عقلمند انسان تین موقعوں پر نہایت ہی احمق بن جاتا ہے۔ جب وہ تنہائی میں آئینے کے سامنے ہو، دوسرے جب وہ بحیثیت ایک عاشق کے اپنے محبوب کے پاس ہو اور تیسرے جب وہ کسی بچّے کو کھلا رہا ہو۔“

چُنّو: ”آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے۔ اور پھر بزرگ حضرات تو ہمارے سامنے ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ ہنسی آتی ہے۔ کوئی قبلہ زبان باہر نکال کر ہلائیں گے۔ کوئی دیدے مٹکانے لگیں گے۔ ایسی ایسی عجیب سُریں نکالتے ہیں کہ تان سین سُن

پائے تو غش کھا جائے۔ کل کا ذکر ہے میرے پنگھوڑے کے قریب ایک بزرگ محوِ مطالعہ تھے۔ میرے دل میں شرارت سوجھی تو رونا شروع کر دیا۔ وہ اُٹھے، پہلے چمکارا، پھر پیار کیا، پنگوڑا ہلایا، گود میں لے کر اِدھر اُدھر بھاگے۔ ہائی جمپ اور لانگ جمپ کر کے دکھائی۔ پھر جو تماشے شروع کئے ہیں، میں بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کر سکا۔ سب سے عجیب و غریب ان کا ناچ تھا جو انہوں نے میرے سامنے کھڑے ہو کر ناچا۔ بالکل کلاسیکل چیز تھی۔ کاش کہ طبلہ ساتھ ہوتا۔ دیر تک لطف اندوز ہوتا رہا۔ جب وہ بالکل تھک گئے تب ترس کھا کر چُپ ہو گیا۔"

کِڈی: "میرے خیال میں بچّوں کے پاس سب سے بڑا حربہ رونا ہے۔ جیسے ایک حسین خاتون کی مسکراہٹ کے سامنے بڑے بڑے سورما ہتھیار ڈال دیتے ہیں اسی طرح ایک بچّے کا رونا بھی قیامت ڈھا سکتا ہے۔"

مُنّے میاں: "معاف کیجیے، میں متفق نہیں ہوں۔ آپ نے رونے کی تھیوری کو بالکل نہیں سمجھا۔ اگر سمجھا ہے تو اسے بے حد محدود کر دیا ہے۔ آپ کے خیالات میں وسعت ہونی چاہیے۔ رونے کے بیشمار فوائد ہیں۔ پہلا تو یہی ہے کہ بڑوں کی توجّہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے رونا پڑتا ہے۔ بالکل جیسے کوئی اپنے بیرے کو آواز دے یا چپڑاسی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجا دے۔ دوسرے یہ کہ بعض اوقات بڑوں کو سزا دینی پڑتی ہے۔ جب کبھی گھر میں مہمان آجائیں یا

کوئی دلچسپ بحث ہو رہی ہو یا سب کے سب کہیں باہر جا رہے ہوں، تب یہ لوگ ہمیں بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس وقت انتقاماً رونا پڑتا ہے۔ اور پھر رونے سے صحت اچھی رہتی ہے۔ ورزش بھی ہو جاتی ہے اور آواز کھُل جاتی ہے۔ پھیپھڑوں کے لیے خصوصاً مفید ہے اور۔۔؟"

ننّھے میاں: "خوب یاد دلایا، میں رونا چاہتا ہوں۔ حضرات اگر میں روؤں تو آپ کو ناگوار تو محسوس نہ ہو گا؟"

کِڈی، مُنّے میاں: "جی نہیں، بڑی خوشی سے رویئے۔"

ننّھے میاں: "شکریہ! بات یہ ہے کہ میں تکیے سے کچھ نیچے سرک گیا ہوں اور خود اُٹھ نہیں سکتا۔ لہٰذا آپا کو بلانا چاہتا ہوں تو پھر اجازت ہے نا؟"

راجہ، چُنّو: "جی ہاں ضرور رویئے۔"

کِڈی: "اگر آپ چاہیں تو میں بھی آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں۔"

ننّھے میاں: "ممنون ہوں۔ مجھے آپ سے یہی امّید تھی۔ لیکن اگر ہم دونوں روئے تو آپا کو یہ پتہ نہ چل سکے گا کہ اسے دراصل بلایا کس نے ہے۔ تو یہ لیجیے بندہ روتا ہے۔"

(ایک وقفہ جس میں آیا آتی ہے اور واپس چلی جاتی ہے)

کِڈی: ”یار تمہاری آیا خوب ہے۔ میری تو آنکھیں چندھیا گئیں۔“

راجہ: ”آپ حُسن پرست معلوم ہوتے ہیں۔“

کِڈی: ”مِرا مزاج تو بچپن سے عاشقانہ ہے۔“

راجہ: ”خوب! گفتگو دلچسپ ہوتی جارہی ہے۔ ہمیں بھی تو کچھ بتایئے۔“

کِڈی: ”تمہیں رازِ محبّت کیا بتائیں

تمہارے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔“

مُنّے میاں: ”واللہ کِڈی صاحب، دیکھئے، وہ گائے جارہی ہے۔“

چُنّو، کِڈی: ”کہاں ہے؟“

مُنّے میاں: ”وہ رہی۔ بھئی مجھے تو بھوک محسوس ہو رہی ہے۔“

ننّھے میاں: ”میری بھی رال ٹپک رہی ہے۔ کیوں حضرت آپ کو بھی گائے کا دودھ مرغوب ہے؟“

مُنّے میاں: ”جی ہاں! میں تو گائے کے دودھ کا عاشق ہوں۔ کِڈی صاحب آپ؟“

کِڈی: ”صاحب مجھے تو بھینس کے دودھ میں پانی ملا کر پلایا جاتا ہے۔“

مُنّے میاں: ”لاحول ولا قوۃ! بھینس کا دودھ ایک نہایت ثقیل چیز ہے۔ اس میں پروٹین کی مقدار تو اتنی ہی ہے لیکن چربی زیادہ ہوتی ہے اور یہ چربی نفاست پسند بچّوں کے لیے مضر ہے۔ کم از کم میں تو اسے ہضم نہیں کر سکتا اور آپ چُنّو صاحب؟“

چُنّو: ”خاکسار کو بکری کا دودھ پسند ہے۔“

مُنّے میاں: ”مجھے تو یہاں کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے حضرت۔ یہ مہاتما گاندھی والا معاملہ تو نہیں؟“

چُنّو: ”کچھ ہے ہی۔“

راجہ: ”اور بندہ اونٹنی کا دودھ بھی پی چکا ہے۔“

ننّھے میاں: ”انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آپ نے نہایت ہی غیر شاعرانہ بات کی ہے۔ کاش کہ کوئی صاحب یہ موضوع بدل دیں۔“

کِڈی: "کل لیٹے لیٹے ایک شعر موزوں ہو گیا۔ عرض کیا ہے۔ ؎

پنگھوڑے ہی میں الجھایا گیا ہوں

کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں"

ننّھے میاں: "مرحبا۔ سبحان اللہ۔ کیا بات ہے"

راجہ: "سنا ہے کہ برازیل میں کپاس کا بھاؤ ایک دم بڑھ گیا ہے اور اس سے جزائر غرب الہند میں تربوز سستے ہو گئے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو ممکن ہے کہ عرب میں کھجوروں کی کاشت پر بہت برا اثر پڑے۔"

(تمام بچّے راجہ کو بُری طرح گھورتے ہیں)

کِڈی: "آج صبح انگوٹھا چوستے چوستے ایک شعر یاد آ گیا۔ ؎

آج وہ بار بار یاد آئے

آج میں بار بار رویا ہوں"

راجہ: "لیکن تبّت میں آلو بخارے دن بدن کم ہوتے جا رہے ہیں اور اگر لنکا سے ارنڈ ککڑیاں فوراً نیوزی لینڈ نہ بھیج دی گئیں تو ایران میں لوہا یکایک سستا ہو جائے گا اور شاید۔۔۔"

چُنّو: ”راجہ یہ تم کیا اُلٹی سیدھی ہانک رہے ہو؟“

راجہ: ”بھئی آپ لوگوں ہی نے تو کہا تھا کہ موضوع بدل دو۔“

ننّھے میاں: ”لیکن یہ بھاؤ وغیرہ کون مسخرہ پوچھنا چاہتا ہے؟“

راجہ: ”کیا بتائیں ہمارے ابّا جان چوبیس گھنٹے گھر میں یہی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ وہ بہت بڑے بزنس مین ہیں۔“

کِڈی: ”پھر تم لوگوں نے بزرگوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ کل ہی کا ذکر ہے، ہمارے ماموں جان آئے اور ہمارا جھنجھنا اُٹھا کر لے گئے۔ بھلا یہ ان کے کھیلنے کا زمانہ ہے۔ آج علی الصبح بھائی جان نے چپکے سے ہماری دودھ کی بوتل خالی کر دی۔ اپنی طرف سے بڑی بھاری شرارت کی۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ سب کے سب ہر روز احسان جتاتے تھے کہ جیسے پال پوس کر ہم پر بڑا اکرم فرما رہے ہیں۔“

راجہ: ”پالنا تو خیر ہو گا، یہ پوسنا کیا مصیبت ہے۔ ہمیں تو ابھی تک نہیں پوسا گیا۔“

کِڈی: ”اور یہ لوگ شاید بھول جاتے ہیں کہ کبھی یہ خود بھی بچّے تھے۔ بچّوں کی عظمت سے مُنکر ہونے والوں کو یہ مشہور قول ضرور یاد رکھنا چاہیے۔ چائلڈ از دی فادر آف مین۔“

ننّھے میاں: "ایک روز امّی مجھے دیر تک گھورتی ہیں، پھر اپنی سہیلی سے بولیں۔ نہ جانے یہ ننھا ہوا میں کیا دیکھتا رہتا ہے۔ دیر تک فرضی چیزوں کو تکتا رہتا ہے۔ مجھے بڑی ہنسی آئی۔ یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ تمام بچّوں کو قدرتی طور پر ہائی پر میٹروپیا ہوتا ہے اور وہ نزدیک کی چیزیں صاف نہیں دیکھ سکتے۔"

مُنّے میاں: "ہمارے ابّا جان کی موٹر ایسی عجیب و غریب چیز ہے کہ بس ڈبیا میں بند رکھنے کے لائق ہے۔ میں اس کی خوبیوں کا ذکر مفصّل طور پر نہیں کر سکتا۔ اتنی سُست رفتار ہے کہ معلوم ہوتا ہے پیدل چل رہی ہے۔"

ننّھے میاں: "اور کل رات مجھے سلانے کے لیے امّی نے آدھ گھنٹے تک لوریاں گائیں۔ بھلا لوریوں سے کون سوتا ہے۔ کوئی فلمی ریکارڈ بجائیں تو کوئی بات بھی تھی۔"

چُنّو: "فلمی گانوں کا معیار بھی دن بدن گرتا جا رہا ہے۔ ایسے ایسے مہمل ریکارڈ سننے میں آتے ہیں کہ بیحد کوفت ہوتی ہے۔ نہ موسیقی ہے نہ شاعری، لوگ نثر گا دیتے ہیں۔"

ننّھے میاں: "میں نے ریڈیو پر بھی اکثر موسیقی کا خون ہوتے دیکھا ہے۔ کتنی ہی مرتبہ گویّے نے صبح کے وقت دُرگا کا خیال گا دیا۔ بھیم پلاسی میں سورٹھ ملا کر

جب آلاپنے لگتے ہیں تو کبھی بھیرویں معلوم ہوتی ہے اور کبھی جوگیا۔ اور شبھ بلمپت درباری دوپہر کو لے بیٹھتے ہیں۔ بعض اوقات رات کو لوگ آساوری گا دیتے ہیں اور ملتانی کافی۔۔۔!"

راجہ: "کیوں صاحب۔ یہ ملتان کی کافی کافی مشہور ہے کیا؟ وہاں کافی کا کیا بھاؤ ہو گا؟"

نھّے میاں: "یہ پینے والی کافی نہیں ہے۔ ایک راگنی کا نام ہے۔ آپ نے پھر بھاؤ کا ذکر کیا۔"

کِڈی: "حضرات! موضوع تبدیل ہونا چاہیے۔ گفتگو خشک ہوتی جا رہی ہے۔"

چُنّو: "اچھا یہ بتائیے کہ آپ بڑے ہو کر کیا کریں گے؟"

کِڈی: "میں بچّوں کی تربیت پر انگریزی میں ایک کتاب لکھوں گا۔"

نھّے میاں: "نہایت نیک خیال ہے۔ آپ یہ کتاب اردو میں لکھئے۔ اس کا نام رکھئے رہنمائے طفلیات یا کلید طفلیات۔"

مُنّے میاں: "اور بازیچۂ اطفال کیسا نام رہے گا؟"

کِڈی: "یہ سب اچھے نام ہیں۔ دراصل اس موضوع پر مفید کتابیں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ بچّوں کی پرورش بھی ایک آرٹ ہے جس سے عوام ناواقف ہیں۔ عجیب عجیب کتابیں لکھتے ہیں کہ ماں بچّے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ بچّہ حقّہ پی رہا ہے اور باپ انگوٹھا چوس رہا ہے۔"

ننّھے میاں: "میں اس کتاب کا دیباچہ لکھوں گا۔ یہ کتاب نہایت مقبول ہوگی۔"

راجہ: (آہستہ سے) "قدرِ اُلّو کی اُلّو جانتا ہے۔ ہما کو چُغد کب پہچانتا ہے۔"

ننّھے میاں: "راجہ صاحب! واللہ آپ محفل میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن اس میں آپ کا قصور نہیں۔ یہ اُونٹ کے دودھ کا قصور ہے۔"

کِڈی: "حضرات! حضرات! آپ تو سچ مچ بڑے بن گئے ہیں۔ آپس میں بڑوں کی طرح لڑ رہے ہیں۔"

راجہ: "میں معافی چاہتا ہوں۔"

مُنّے میاں: "میں نے معاف کیا۔"

چُنّو: "کیوں صاحب آپ نے وہ پکچر دیکھی تھی۔ فورٹی لِٹل مَدرز؟"

مُنّے میاں: ”جی ہاں دیکھی تھی۔ اس میں بڑوں کا ایکٹنگ فضول سا تھا البتہ اس بچّے کا ایکٹنگ ہمیں بہت پسند آیا۔ وہ انگوٹھا بڑے سٹائل سے چُوستا تھا۔“

کِڈی: ”خوب یاد آیا۔ دیر سے ہم نے انگوٹھا نہیں چوسا۔ آپ انگوٹھا چوسئے مُنّے میاں۔“

مُنّے میاں: ”اجی حضرت آپ چوسیے۔“

ننّھے میاں: ”واللہ چُنّو صاحب پہلے آپ۔“

چُنّو: ”قبلہ پہلے آپ۔“

کِڈی: ”آپ حضرات تو تکلف کرتے ہیں۔ اماں چوسئے بھی سہی۔ اچھا چلئے آپ پہل کیجئے مُنّے میاں۔“

مُنّے میاں: ”بندہ پرور یہ خاکسار ابھی ابھی چوس چکا ہے۔ آپ شوق فرمائیے۔“

کِڈی: ”آپ تو کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔“

راجہ: ”اچھا میں پہلے چُوستا ہوں۔“

مُنّے میاں: (غصّہ ضبط کرتے ہوئے) ”راجہ صاحب، اب میں آپ کو کیا کہوں؟ کاش کہ آپ انسانی سائیکالوجی سے واقف ہوتے۔“

راجہ: ”اس مرتبہ آپ کا غصّہ بالکل بے موقعہ ہے۔ آخر کوئی نہ کوئی تو پہل کرتا ہی۔ میں نے کون سا گناہ کر دیا۔ اور یہ سائیکلوں کے متعلق آپ کیا فرما رہے ہیں؟“

مُنّے میاں: ”سائیکالوجی (زور سے) سائیکالوجی!“

راجہ: ”وہ کیا چیز ہوتی ہے؟“

مُنّے میاں: ”وہ ہمیں زندگی کی گہرائیوں میں لے جاتی ہے۔ اب آپ کو اتنی جلدی کیا خاک سمجھاؤں۔ ایک مثال دیتا ہوں۔ بھلا یہ آپ کیونکر ثابت کریں گے کہ آپ بچّے ہیں؟“

راجہ: ”میں بچّہ ہی تو ہوں۔ نظر جو آرہا ہوں“

مُنّے میاں: ”نہیں یوں نہیں۔ دلائل سے ثابت کیجئے۔ چلئے میں بتاتا ہوں۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ بچّوں کے مُنہ میں دانت نہیں ہوتے اور آپ کے مُنہ میں بھی دانت نہیں ہیں۔ لیکن بوڑھوں کے مُنہ میں دانت کہاں ہوتے ہیں۔ اس لیے یا تو آپ بچّے ہیں یا بوڑھے ہیں۔ دوسرا نکتہ ہے۔ آپ کا گزارا دودھ پر ہے لیکن بلّی بھی دودھ پیتی ہے۔ لہٰذا یا تو آپ بچّے ہیں یا بلّی ہیں۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ آپ کے سر پر بال بہت کم ہیں۔ گنجے آدمیوں کے سر پر بھی بال نہیں ہوتے لہٰذا۔۔“

کِڈی: ”حضرات! خاموش! وہ سامنے دیکھئے۔۔۔!“

سب بچّے خاموش ہو جاتے ہیں۔ ایک آیا گاڑی لیے آرہی ہے جس میں دس بارہ مہینے کی ایک خوبصورت بچّی ہے۔ دوسری گاڑیوں کے پاس گاڑی چھوڑ کر آیا پلاٹ میں آیاؤں کے پاس چلی جاتی ہے۔ بچّے خاموش ہیں، بچّی سب کی طرف دیکھتی ہے۔

بچّی: ”آداب عرض! غالباً میں آپ کی گفتگو میں مخل ہوئی ہوں۔“

چُنّو: ”جی نہیں۔“

بچّی: ”میں اپنا تعارف آپ کرائے دیتی ہوں۔ میرا نام فیٹو ہے اور میری عمر (شرما کر) ہوگی یہی ایک ڈیڑھ مہینہ۔ یہ ماسٹر کِڈی ہمارے پڑوس میں رہتے ہیں اور مجھے جانتے ہیں۔“

راجہ: ”فیٹو کا کیا مطلب ہوا؟“

ننّھے میاں: (جھنجھلا کر) ”ناموں کا بھی کوئی مطلب ہوتا ہے؟ (آہستہ سے) راجہ خدا کے لیے تم چُپ رہو۔“

فیشو: ”جی فیٹ کا مطلب ہے موٹا (شرما کر) سب مجھے موٹی بچّی سمجھ کر پیار سے فیٹو کہتے ہیں۔ ویسے میں آج کل Slimming کر رہی ہوں۔ پہلے سے دُبلی ہو گئی ہوں لیکن یہ لوگ میرا نام نہیں بدلتے۔“

مُنّے میاں: (آہستہ سے) ”چُنّو میاں، ذرا کِڈی صاحب کو دیکھنا۔ کیسا شرما رہا ہے۔“

ننّھے میاں: (آہستہ سے) ”نظریں تو اٹھاتا ہی نہیں، چہرہ الگ لال بھبھوکا ہو رہا ہے۔ کیا تو چٹاخ پٹاخ بول رہا تھا۔ کیا اب بالکل سانپ سونگھ گیا ہے۔“

ننّھے میاں: (آہستہ سے) ”راجہ پلیز آہستہ بولو۔ بہتر یہی ہو گا کہ تم خاموش رہو۔“

فیٹو: ”آپ سب حضرات کا یک لخت خاموش ہو جانا عجیب معلوم ہوتا ہے۔ سنائیے ماسٹر کِڈی آپ کیسے ہیں؟“

کِڈی: ”حال اچھا ہے۔“

مُنّے میاں: (دبی زبان سے)

”اِن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے مُنہ پر رونق

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے!"

راجہ:(زور سے گاتے ہوئے)

"آیا کرو اِدھر بھی مری جاں کبھی کبھی

نکلا کریں ہمارے بھی ارماں کبھی کبھی"

ننّھے میاں: (آہستہ سے) "لعنت ہے یار راجہ تم پر۔ تمیز تو پاس سے بھی نہیں گزری۔ ڈوب مرو کہیں جا کر۔"

(ایک وقفہ)

فیٹو: "اب مجھے یقین ہوتا جارہا ہے کہ میں واقعی مخل ہوئی ہوں۔ مجھے افسوس ہے۔"

چُنّو، ننّھے میاں: "جی نہیں۔"

فیٹو: "تو پھر آپ لوگ خاموش کیوں ہیں؟"

مُنّے میاں: "جی نہیں خاموش تو نہیں ہیں۔"

(ایک وقفہ)

اتنے میں فیٹو کی آیا آتی ہے اور اسے لے جاتی ہے۔ جاتے جاتے فیٹو مُڑ مُڑ کر کِڈی کو دیکھتی جاتی ہے اور سب بچّے کِڈی پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

ننّھے میاں: ”اچھا تو یہ بات ہے۔ بڑے کائیاں نکلے یار کِڈی!“

مُنّے میاں: ”کِڈی یار اکیلے ہی اکیلے۔ ہمیں اطلاع تک نہ دی۔“

چُنّو: ”انتخاب کی ہم بھی داد دیتے ہیں۔“

کِڈی: ”حضرات پہلی نگاہ میں محبّت ہو جانے کے آپ قائل ہیں یا نہیں؟“

راجہ: ”ہاں میرے خیال میں اس طرح کافی وقت بچ جاتا ہے۔“

ننّھے میاں: ”بھئی کِڈی ایسی باتوں سے کسی اور کو ٹرخانا۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ ع یوں چھپایا رازِ دل ہم نے کہ افشا کر دیا۔“

کِڈی: (شرما کر) ”آپ لوگ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

مُنّے میاں: ”ذرا تجاہلِ عارفانہ تو ملاحظہ ہو۔ اجی حضّت، محبّت اندھی ہوتی ہے لیکن اڑوس پڑوس والے اندھے نہیں ہوتے۔ ع تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے۔“

(سب کِڈی کو چھیڑتے ہیں)

کِڈی: ”آپ مصر ہیں تو سن لیجئے۔ لیکن قول دیجئے کہ کسی اور کو نہیں بتائیں گے۔ آپ کا خیال صحیح ہے لیکن یہ میں بتادوں کہ پہل اس طرف سے ہوئی تھی۔“

ننّھے میاں: ع ”عشق اوّل دردِ دل معشوق پیدا می شود۔“

راجہ: (گا کر) ع ”وجودِ زن سے تصویرِ کائنات میں رنگ۔“

ننّھے میاں: ”راجہ تم پرلے درجے کے بد مذاق بچّے ہو۔ اس مصرعے کی یہاں کیا ضرورت تھی۔ خیر چونکہ اُونٹ کا دودھ پی چکے ہو اس لیے جاؤ معاف کیا۔“

چُنّو: ”حضرات معاف کیجئے۔ میں پھر نیچے سِرک گیا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ذرا رولوں؟“

ننّھے میاں: ”مجھے خود بھوک لگ رہی ہے۔ ٹھہریئے میں آپ کے ساتھ روؤں گا۔“

مُنّے میاں: ”اور مجھے بھی ایک مکھّی دیر سے ستا رہی ہے۔ اجازت ہے کِڈی صاحب؟“

کِڈی: ”میں خاموش رہ کر کیا کروں گا؟ چلئے شوق فرمایئے۔“

مُنّے میاں: ”راجہ صاحب آپ بسم اللہ کیجئے۔“

راجہ: ”ننّھے صاحب میں اس مرتبہ ہرگز پہل نہیں کروں گا۔“

ننّھے میاں: ”آپ تو سچ مچ بُرا مان گئے۔ چلئے اب روئیے بھی۔“

سب رونے لگتے ہیں، آیائیں آجاتی ہیں اور محفل برخاست ہو جاتی ہے۔

مجبوریاں

ایک روز ایک اجنبی حضرت اپنا رومان انگیز افسانہ دکھانے لائے تاکہ اسے پڑھ کر اپنی رائے دے سکوں۔ وہ افسانہ یوں شروع ہوتا تھا۔۔۔

”وہ دیر سے کھڑا نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے پاؤں تلے سبزہ مخمل کی طرح بچھا ہوا تھا جس پر طرح طرح کے پھولوں نے سلمیٰ ستارے کا کام کر رکھا تھا۔ اس کے دل میں خیالات اس روانی کے ساتھ آ رہے تھے جیسے کوئی اعلیٰ درجے کی سنگر مشین بخیہ کر رہی ہو یا کوئی تیز قینچی کتر کتر چل رہی ہو۔ بعض اوقات کوئی پرندہ دفعتاً چیخ اُٹھتا اور اس کے خیالات کا سلسلہ یوں منقطع ہو جاتا جیسے دھاگہ ٹوٹ جائے یا یکایک سوئی چُبھ جائے۔ وہ اپنی نگاہوں کے گز سے قدرت کا ناپ لے رہا تھا۔ سر پر آسمان نیلے رنگ کی واسکٹ پہنے ہوئے تھا جس میں بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سفید بٹنوں کی طرح جڑے ہوئے تھے۔ نالے کا بہتا ہوا پانی سفید ململ کے کھُلے ہوئے تھان کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ جس میں سورج کی نارنجی شعاعوں نے گوٹہ کناری کا کام۔۔۔“

"معاف کیجئے۔" میں نے پوچھا۔ "آپ کہیں درزی تو نہیں ہیں؟"

"جی نہیں۔" وہ شرما کر بولے۔ "میں ٹیلر ماسٹر ہوں۔"

میرے ایک دوست جو موٹروں کے ورکشاپ کے مالک تھے اور مدّت سے موٹروں کا علاج معالجہ کر رہے تھے۔ موٹریں اور پرزے ان کے دماغ پر اس قدر چھا گئے تھے کہ بعض اوقات وہ سوتے سوتے چلّا کر کہتے۔ "بریکیں لگاؤ۔ اسٹارٹ کرو۔"

ایک دفعہ ہم دونوں اُونٹ پر سوار ہوئے۔ میں آگے تھا اور مہار میرے ہاتھ میں تھی۔ ہم ایسی جگہ سے گزر رہے تھے جہاں پانی ہی پانی تھا۔ اُونٹ کچھ تیز ہو گیا۔ ایک جگہ تو پھسلتے پھسلتے بچا۔ میرے دوست گھبرا کر بولے۔ "بھئی اُونٹ کو نمبر ٹو میں لے آؤ۔" ایک وقفے کے بعد بولے۔ "میرا مطلب ہے ذرا آہستہ چلاؤ۔"

اس اُونٹ کی طبیعت میں کچھ ایسی بے نیازی تھی کہ جو ہدایات میں اسے دیتا وہ ذرا پرواہ نہ کرتا۔ جب ہم اسے روکنا چاہتے تو وہ رُکتا ہی نہ۔ ایک جگہ میرے دوست بولے۔ "اس اُونٹ کی بریکیں خراب ہیں؟" میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو وہ جلدی سے کہنے لگے۔ "یعنی اسے روکنا چاہو تو بہت دیر میں رُکتا ہے۔" اور ساتھ ہی ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں کہ میں مجبور ہوں، میں

جانتا ہوں کہ اُونٹ میں گیئر نہیں ہوتے، نہ بریکیں ہوتی ہیں، لیکن میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔

ایک بے حد کفایت شعار حضرت جب کبھی مجھے تار بھیجتے تو ہمیشہ انتہائی اختصار سے کام لیتے۔ ان کے تار کچھ اس قسم کے ہوتے۔ "آجاؤ"، "آج اسٹیشن"، "ٹھیک ہے۔"

ایسے تار لے کر مجھے کتنی کوفت ہوتی ہو گی، یہ ظاہر ہے۔ جب وہ ملنے آتے اور صرف "آج اسٹیشن" لکھتے تو میں علی الصبح اسٹیشن پر جا بیٹھتا اور آدھی رات تک جتنی گاڑیاں آتیں ان سب میں تلاش کرتا۔ اس طرح جب وہ تار میں صرف "نہیں" یا "ہاں" لکھتے تو میں سوچنے بیٹھ جاتا کہ ان کا مطلب کیا ہے اور مجھے ایک اور تار بھیجنا پڑتا۔ بعض اوقات تو میں خود جا کر ان سے ملتا کہ سب کچھ اچھی طرح سمجھ سکوں۔ اس کے برعکس ایک بے حد فضول خرچ حضرت کچھ اس قسم کا تار بھیجا کرتے تھے۔۔۔

"سناؤ بھئی کیا حال ہے؟ تم بھی کمال کرتے ہو۔ اتنے عرصے سے کوئی خط نہیں لکھا۔ اگر آج شام کو فرصت ہو تو براہِ کرم شام کو تھری ڈاؤن گاڑی پر ملو جو چار نمبر پلیٹ فارم پر پونے سات بجے پہنچتی ہے۔ یہ یاد رکھنا کہ کبھی کبھی وہ لیٹ بھی

ہو جاتی ہے ۔باقی باتیں ملنے پر ہوں گی۔ اس تار کو ضروری سمجھنا، سب کو سلام۔"

کسی نے کہا ہے (غالباً شیکسپیئر نے، کیونکہ عموماً وہی کہا کرتا ہے) کہ مجھے کسی شخص کے دوست دکھا دو اور میں بتا دوں گا کہ وہ شخص کتنے پانی میں ہے۔ ایک اور صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ کوئی شخص کس فلم کمپنی کی فلمیں پسند کرتا ہے اور میں فوراً بتا دوں گا کہ وہ شخص کیسا ہے۔ کئی حضرات دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ٹائی کی گرہ، جوتوں کے سائز اور موچھوں کی لمبائی دیکھتے ہی سب کچھ بتا دیں گے۔ یہ سب کچھ بجا سہی لیکن بھلا اس قدر محنت کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اتنی چھان بین کاہے کو کرتے ہیں کہ ناپ لیتے پھریں یا اس کے دوستوں کے پیچھے خفیہ پولیس کی طرح پھریں۔ آپ محض چند منٹ کی خاموشی سے اس شخص کا مطالعہ کیجئے اور وہ خود سب کچھ بتا دے گا۔ وہ مجبور ہے یا یوں کہئے کہ وہ اپنی عادت سے مجبور ہے۔ ہم سب مجبور ہیں۔

طلباء کی سب سے بڑی کوشش یہی ہوتی ہے کہ ہر ممکن طریقے سے پڑھائی سے بچیں۔ ہوشیار سے ہوشیار طالب علم بھی پڑھائی لکھائی کو بار سے کم نہیں سمجھتا۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ چند طالب علم دیر سے بحث کر رہے تھے کہ پڑھا جائے یا باہر چلا جائے۔ جب وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے تو ایک بولا۔ "میں ٹاس

کرتا ہوں۔ اگر چہرہ آیا تو سینما چلیں گے، اگر پُشت آئی تو سرکس دیکھیں گے اور اگر روپیہ سیدھا کھڑا ہو گیا تو خوب پڑھیں گے۔"

بچّوں کے متعلق ایک دوست نے قصّہ سنایا۔ ان کے دو چھوٹے بچّے حسبِ معمول اپنی ساری کوششیں اس جدوجہد میں صرف کرتے تھے کہ کہیں انہیں کوئی پڑھا نہ دے۔ حساب سے تو یہ خاص طور پر متنفّر تھے۔ آخر میرے دوست عاجز آ گئے اور انہوں نے اُستاد کے لیے اخبار میں اشتہار نکلوا دیا۔ ایک اُستاد آئے اور بڑی اُستادی سے انہوں نے بچّوں کی پسند اور ناپسند کا پتہ چلایا۔ بچّوں کو خرگوش بے حد پسند تھے۔ چنانچہ وہ چھ خرگوش لے کر بچّوں کے پاس پہنچے۔ خرگوش دیکھ کر بچّے بہت خوش ہوئے اور ان سے کھیلنے لگے۔ اُستاد بولے۔ "بچّو! بھلا بتاؤ تو سہی یہ کتنے ہیں؟" ایک بچّے نے گِن کر کہا "چھ"۔ انہوں نے تین خرگوش چھپا لیے پھر پوچھا۔ "اور اب باقی کتنے رہ گئے؟" بچّے نے پھر گِنا اور بولا "تین" ایک چھوٹا بچّہ بڑے کو ایک طرف لے گیا اور اس کے کان میں کہنے لگا۔ "خبر دار میرے دل میں شُبہ سا ہے ذرا ہوشیار رہنا کہیں یہ آدمی باتوں باتوں میں حساب نہ پڑھا دے۔"

آج سے کئی سال پہلے ایک فلاسفی کے پروفیسر ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ میری ان کی جان پہچان تھی۔ ایک روز ہم ریڈیو سُن رہے تھے۔ کوئی محترمہ گا رہی تھیں۔ ع

نَیر بھرن کیسے جاؤں ری سکھی

گانے میں انہوں نے پنگھٹ پر جانے کے سلسلے میں معذوری ظاہر کی تھی اور شاید کوئی وجہ بھی پیش کی تھی۔ لیکن بار بار وہ یہی کہتی تھی کہ 'نَیر بھرن کیسے جاؤں ری سکھی'۔

پروفیسر صاحب سنتے رہے پھر چونک کر بولے۔ "کیا لغویت ہے۔ آخر سقّے کِس مرض کی دوا ہیں؟ پنگھٹ پر کوئی سقّہ کیوں نہیں بھیج دیتے؟"

باتوں باتوں میں وہ بولے۔ "'کل میں نے عجیب خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جیسے میں کلاس میں ہوں اور لیکچر دے رہا ہوں اور جب میری آنکھ کھلی تو میں واقعی کلاس میں تھا اور لیکچر دے رہا تھا۔"

میں اچھی طرح نہ سمجھ سکا۔ میں نے پوچھا۔ "بھئی آپ کیا فرما رہے تھے؟"

"معلوم نہیں کیا کہہ رہا تھا۔" وہ بولے۔ "میں متوجہ نہیں تھا۔"

ایک روز انہوں نے صبح صبح مجھے دوڑتے ہوئے دیکھ لیا۔ شام کو مِلے۔ پوچھنے لگے۔ میں نے کہا۔ "ورزش کر رہا تھا۔" بولے "لاحول ولا قوۃ! میں تو صرف اس وقت دوڑتا ہوں جب کوئی میرے پیچھے دوڑتا ہے۔"

ایک اور بہت بڑے فلاسفر تھے جنہوں نے ایک کتب فروش کو یہ خط لکھا تھا۔

"جنابِ من!

اوّل تو میں نے یہ بیہودہ کتاب آپ سے ہرگز نہیں منگوائی۔ اگر منگوائی تھی تو آپ نے ہرگز نہیں بھیجی۔ اگر آپ نے بھیجی تو مجھے بالکل نہیں ملی۔ اگر مجھے ملی تھی تو میں نے قیمت ادا کر دی تھی۔ اور اگر میں نے قیمت نہیں ادا کی تو آپ سے جو کچھ بھی ہو سکتا ہے کر لیجئے۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ فقط۔"

ایک مرتبہ وہ کسی حجّام کی دکان پر حجامت کرا رہے تھے۔ دفعتاً کوئی سڑک پر چلایا۔ "میاں عبد القدوس صاحب! میاں عبد القدوس صاحب! آپ کے مکان کو آگ لگ گئی۔" وہ تڑپ کر اٹھے۔ حجام کو پرے دھکیلا۔ گلے کا سفید کپڑا ایک طرف دے مارا، صابن کا جھاگ ایک اور صاحب پر پھینکا۔ دو گاہکوں سے بُری طرح ٹکرائے۔ سڑک پر کودے، پھسلے، گِرے، پھر اٹھے، ایک دہی بڑے والے سے ٹکرائے۔ اچھل کر بھاگے، کچھ دور جا کر رُک گئے اور سر کھجانے

لگے۔ پھر شرمندہ ہو کر بولے۔ ''اُفّوہ! میں بھی کیا ہوں، بھلا میرا نام عبدالقدوس کہاں ہے؟''

ڈاکٹروں کی گفتگو بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ ایسی کہ آدمی سُنتے ہی کہہ دے کہ ڈاکٹر بول رہے ہیں۔ کوئی بھی موضوع ہو، کیساہی موقع ہو، لیکن ان کی گفتگو میں بیماریوں اور دواؤں کے نام باقاعدہ آتے رہیں گے اور کچھ اس قسم کی باتیں آپ سنیں گے۔ ''مجھے اقبال کا کلام بے حد پسند ہے۔ ٹیگور بھی پسند ہے۔ یہ دونوں شاعر ہندوستان کی ناک ہیں اور بھلااس نمونئے والے کیس کا کیابنا؟''

آپ پُرانے شاعر کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بھلا آپ غالب کو شعرا کی صف میں شامل کیوں نہیں کرتے؟ شکر ہے کہ وہ مریض اب اچھاہے۔ اسے سلفامائیڈ دے رہاہوں۔ ڈاکٹر ق صاحب سمجھتے تھے کہ اکیوٹ برانکائیٹس ہے حالانکہ صاف نمونیہ ہے۔

''لیکن جو جدّت اور ندرتِ خیال اقبال کے کلام میں ہے، جو سادگی و پرکاری ٹیگور کی شاعری میں ہے، اس سے پرانے شعرا محروم ہیں۔ پرانے شعرا کے موضوعِ سخن ایک جیسے ہیں۔ ایک حد تک فرسودہ ہیں۔ اور وہ ملیریاوالا مریض تو آپ نے

دیکھا ہی ہو گا اسے ساتھ سے ٹانسلائیٹس بھی تھا۔'ن' صاحب اسے ڈپھتھیریا سمجھ رہے تھے۔"

"اگر آپ غالب کی عظمت سے منکر ہیں تو میں آپ کے مذاق پر افسوس ظاہر کرتا ہوں۔ آپ نے بجنوری مرحوم کا وہ فقرہ سنا ہو گا کہ ہندوستان میں آسمانی کتابیں دو ہیں۔ ایک وید دوسری دیوانِ غالب، وہ تپ دق کا مریض۔۔۔" وغیرہ وغیرہ۔ یا پھر اس طرح کی گفتگو ہو گی۔

"جب میں پیرس میں تھا تو ایک نہایت ہی لاجواب کیس دیکھا۔ کسی حادثے سے ایک شخص کی ساری ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔"

"میں نے لِورپول میں نہایت ہی حسین کیس دیکھے تھے۔ ایک شخص کے کان چھ چھ انچ لمبے ہو گئے تھے اور ایک شخص کے ماتھے پر سینگ اُگ رہا تھا۔"

"اور لندن میں مَیں نے ایک خوبصورت کیس دیکھا تھا جس کی ناک اس قدر موٹی ہو گئی تھی کہ دُور سے بالکل گینڈا معلوم ہو رہا تھا۔"

آفیشل خط و کتابت بھی نہایت دلچسپ چیز ہے۔ اس میں خط و کتابت کے مقررہ آداب اور کاغذی کاروائی زیادہ ہوتی ہے۔ دماغی کام بہت کم ہوتا ہے۔

بعض اوقات عجیب و غریب خطوط دیکھنے میں آتے ہیں جو کاروباری لحاظ سے بالکل مکمل ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک فرم نے دوسری فرم کو لکھا کہ ہمارا فلاں فلاں آرڈر منسوخ کر دو۔ جواب آیا کہ آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ جب آپ کی باری آئے گی تب آرڈر منسوخ ہو گا۔

ایک بوڑھے پنشنر کی پنشن دفعتاً بند ہو گئی۔ جنوری سے جون تک کچھ نہ ملا۔ آخر تنگ آ کر اُس نے اُوپر خط لکھا، وہاں سے جواب آیا کہ کاغذات کے مطابق آپ کا کئی ماہ سے انتقال ہو چکا ہے اس لیے پنشن بند کر دی گئی ہے۔ اس نے لکھا کہ جنابِ من میں تو باقاعدہ زندہ ہوں۔ جواب آیا کہ آپ سرٹیفکیٹ بھیجیے۔ یہ ضلع کمشنر کے پاس گیا۔ کمشنر بڑا ہنسا اور سرٹیفکیٹ لکھ دیا کہ میں فلاں صاحب کو اپریل سے دیکھ رہا ہوں اور تصدیق کرتا ہوں کہ یہ زندہ ہیں۔ نیچے جون کی کوئی تاریخ لکھ دی۔ پنشنر نے وہ سرٹیفکیٹ اور ایک خط اُوپر بھیج دیا۔ اگلے ہفتے تین ماہ کی پنشن آ گئی۔ ساتھ ہی ایک خط جس میں لکھا تھا۔ ”جنابِ من! آپ کے سرٹیفکیٹ کے مطابق اپریل مئی اور جون کی پنشن ارسال ہے۔ براہِ کرم ایک اور سرٹیفکیٹ ارسال فرمایئے کہ آپ اسی سال جنوری، فروری اور مارچ میں بھی زندہ تھے تاکہ آپ کی بقیہ پنشن بھی بھیج دی جائے۔“

قنوطیت ایک ایسی چیز ہے جو کبھی چھُپی نہیں رہتی۔ قنوطی صاحب گویا چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ ادھر دیکھولو گو میں قنوطی ہوں۔

ایک قنوطی حضرت۔۔۔۔ جب کبھی ملنے آتے تو کچھ اس طرح گفتگو شروع کرتے۔

"میں ستایا ہوا ہوں۔ بوکھلایا ہوا ہوں، رنجیدہ ہوں، غم دیدہ ہوں، غمگین ہوں، غمزدہ ہوں، غم کا مارا ہوں۔"

میں جواب دیتا۔ "مجھے افسوس ہے، تاسف ہے، قلق ہے، فکر ہے، تشویش ہے۔" اس کے بعد باتیں شروع ہوتیں جن سے ظاہر ہوتا کہ قدرت خاص طور پر ان کے پیچھے لٹھ لے کر پڑی ہوئی ہے۔ فرشتے محض ان کو ستانے کے لیے اپنے پروگرام بدلتے ہیں۔ چاند، سورج، آندھی، مینہ سب اُن کے دشمن ہیں۔ اگر یہ فٹ بال کا میچ دیکھنے جاتے ہیں تو ان کی محبوب ٹیم اس لیے ہار جاتی ہے کہ ان جیسا بدقسمت میچ دیکھ رہا ہے۔ اگر جیتتی ہے تو ان کی موجودگی کی وجہ سے گول کم ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا ہوّا بنا لیتے، فرماتے۔ "میاں اگر قسمت اچھی ہوتی تو کل تاش کی بازی ہی کیوں ہارتے"۔۔۔ یا۔ "زندگی میں اگر کچھ ملنا ہوتا تو پرسوں سینما کے ٹکٹ ہی کیوں نہ مل گئے۔" اور۔ "مجھے سا بدقسمت اس شہر میں

آ گیا ہے، تبھی تو یہاں ہر روز آندھیاں آتی ہیں۔ جھکڑ چلتے ہیں اور اتنی گرمی پڑتی ہے۔ جیسے ان کے چلے جانے سے شہر کی آب و ہوا بدل جائے گی۔"

آپ کسی کالج یا سکول کے اسٹاف روم میں جا بیٹھئے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد بغیر کسی تعارف کے آپ ہر ٹیچر یا پروفیسر کو پہچان لیں گے۔

ایک مرتبہ میں ایک تقریب میں گیا اور میں نے ذرا سی دیر میں سب کو پہچان لیا۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ جغرافیہ کے پروفیسر نے کسی جگہ کے متعلق دریافت کیا۔ جب انہیں اس جگہ کی آب و ہوا بتائی گئی تو مُسکرا کر بولے۔ "تو یوں کیوں نہیں فرماتے کہ بحیرہ روم کے خطے جیسی آب و ہوا ہے۔" تاریخ کے پروفیسر بولے۔ "سلوک؟ ایمان کی بات تو ہے کہ یہاں وہی سلوک ہونا چاہیے جو سکندر نے پورس کے ساتھ کیا تھا؟"

ریاضی کے پروفیسر فیصدی کے سوا بات ہی نہ کرتے تھے۔ مثلاً ہندوستان میں اسّی فیصدی آدمی چڑچڑے ہیں۔ افغانستان میں ساٹھ فیصدی آدمی چھینکیں مارتے رہتے ہیں۔ عرب میں نوّے فیصدی آدمی بات بات پر لاحول ولا پڑھتے ہیں۔

انہوں نے فلاسفی کے پروفیسر پر چوٹ کی۔ وہ چڑ گئے اور بحث ہونے لگی۔ ریاضی کے پروفیسر بولے۔ "ریاضی ایک سچّا علم ہے۔ اس میں صداقت ہے کیونکہ ہندسے کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ مثال کے طور پر اگر ایک آدمی ایک کمرہ دس روز میں بنا سکتا ہے تو دس آدمی اس کمرے کو ایک روز میں بنا سکتے ہیں۔"

فلاسفی کے پروفیسر کچھ دیر حساب لگاتے رہے۔ پھر بولے۔ "اگر دس آدمی اس کمرے کو ایک روز میں بنا سکتے ہیں تو ۲۴۰ آدمی ایک گھنٹے میں بنا سکتے ہیں۔ ۱۴۴۰۰ آدمی ایک منٹ میں اور ۸۶۴۰۰۰ آرمی اسی کمرے کو بخوبی ایک سیکنڈ میں بنالیں گے۔"

"ہندوستان میں اسّی فیصد آدمی چڑچڑے ہوتے ہیں۔" ریاضی کے پروفیسر کھسیانے ہو کر بولے۔

ایک مرتبہ ایک لیڈر سے ملاقات ہوئی۔ وہ باتیں کرتے وقت بار بار کہتے تھے۔ "خواتین و حضرات!" حالانکہ محفل میں صرف حضرات تھے۔ ایک دو مرتبہ ان کی زبان سے "بہنو اور بھائیو" بھی نکل گیا۔ بعض اوقات وہ جوش میں آکر میز پر مکّا بھی مار دیتے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ اپنی عادت سے مجبور ہیں۔

چند لڑکوں نے شرارتاً ان کو ایک آسیب زدہ کمرے میں سُلا دیا۔ جہاں سچ مچ بھوت رہتا تھا۔ رات کو جب بھوت نظر آیا تو یہ اسے دیکھ کر بولے۔

"تم جو کچھ بھی ہو اور جہاں کہیں بھی رہتے ہو، مجھے اُمّیدِ کامل ہے کہ تم انسانی ہمدردی اور اخوّت کا ثبوت دیتے ہوئے قصبہ سدھار کمیٹی کی ضرور مدد کروگے اور دنیا اور عقبیٰ دونوں میں سرخرو ہوگئے۔ تم اپنا چندہ سیکرٹری صاحب کے نام بھیج سکتے ہو۔"

اور سنتے ہیں کہ بھوت وہاں سے ایسا غائب ہوا کہ آج تک لوٹ کر نہیں آیا۔ ہمارے کالج میں ایک ماہر، اقتصادیات تھے۔ ایک دن ہم نے ان کا اشتہار اخبار میں پڑھا جو انہوں نے نوکری کے لیے دیا تھا۔ اشتہار کا ایک ایک لفظ چلّا چلّا کر اقتصادیات پڑنے کی شکایت کر رہا تھا۔ لکھا تھا:

"ضرورت ہے ایک نوجوان صالح وخوش خصال و نیک اطوار کی، جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جاسکے۔ اعلیٰ درجے کے اخلاق کا مالک ہو۔ نہایت تندرست اور توانا ہو۔ سگریٹ پینے والے ہرگز درخواست نہ دیں۔ اچھے خاندان والے کو ترجیح دی جائے گی۔ خوشخط ہو، پرندوں سے محبّت کرتا ہو، زندہ دل ہو، مصیبت میں ہرگز نہ گھبرائے، کفایت شعار ہو، موٹر بھی چلا سکتا ہو، جوتوں کی مرمت بھی بخوبی کر سکتا ہو۔ بندوق چلا سکتا ہو، چارپائیاں بُن سکتا ہو۔ حساب کا ماہر ہو، ضرورت پر

حجام کا کام بھی بخوبی کر سکتا ہو، کپڑے دھو سکتا ہو۔ تنخواہ پندرہ روپے ماہوار دی جائے گی۔ پہلے چھ ماہ ملازمت عارضی ہو گی۔ اس کے بعد ڈیڑھ روپے ماہوار الاؤنس ملے گا۔"

کچھ عرصے کے بعد انہوں نے ہمیں چائے پر بلایا۔ وہاں ہم نے ان کا نوکر دیکھا۔ عجب سست الوجود نوکر تھا۔ اشتہار میں جتنی خوبیاں لکھی گئی تھیں، غالباً ان میں سے ایک بھی اس میں نہیں تھی۔ اسے جو حکم دیئے جا رہے تھے وہ بھی اقتصادیات سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً "سارے پلنگ چھت پر لے جاؤ، ان پر بستر کر دو صحن میں چھڑکاؤ کر دو اور کرسیاں نکال دو۔ بس اس کے بعد آرام کرو۔" پندرہ منٹ کے بعد پھر اسے بلایا جاتا اور حکم ملتا۔ "شام کا کھانا چھت پر کھائیں گے۔ باورچی خانے سے سارے لوازمات اوپر لے جاؤ۔ میلے کپڑے دھوبی کو دے آؤ۔ بازار سے دوڑ کر پھل لے آ۔ بجلی والے سے پنکھا لے آؤ، غالباً مرمت ہو چکی ہو گی۔ یہ خط بڑے ڈاک خانے میں فوراً ڈال دو کہیں ڈاک نہ نکل جائے۔ اس کے بعد تمہاری چھٹی ہے۔"

ذرا سی دیر کے بعد پھر ایک تازہ ارشاد ہوتا۔ "ذرا دوڑ کر دیکھ آؤ کہ سینما میں کونسی پکچر لگی ہوئی ہے۔ بشیر صاحب سے پوچھنا کہ وہ آپ نے سینما کے پاس کا وعدہ کیا تھا، کب تک انتظار کیا جائے اور ہاں پٹرول کے کوپن لے جاؤ اور پٹرول

لے آؤ۔ بکسٹال سے دوڑ کر ویکلی کا نیا پرچہ لے آؤ۔ گیراج والے سے موٹر کے بارے میں پوچھنا۔ واپسی میں برف لیتے آنا۔ بس فقط اتنا سا کام ہے اس کے بعد مزے سے آرام کرنا۔"

ایک اور لفظ جس کا استعمال ہم ہر روز کرتے ہیں وہ ہے "دیسی"۔

قسم قسم کے بڑھیا آم ہیں۔ الفانسو، طوطا پری، سرولی، لنگڑا، لولا، یہ اور وہ۔ لیکن جو آم بالکل فضول ہو، جس کی گٹھلی بڑی اور چھلکا موٹا ہو، جس میں رَس نام کو نہ ہو، ہم اسے "دیسی آم" کہتے ہیں۔ اسی طرح سب سے گھٹیا کپڑے کو "دیسی کپڑا" اور ہندوستانی افسروں کو "دیسی صاحب" کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک مجبوری ہے۔

بعض اوقات میں یہ سوچتا ہوں کہ میری ذاتی مجبوریاں کیا کیا ہیں؟ ایک تو مجھے آپ اَپ اور ڈاؤن ٹرین کی کبھی پہچان نہیں رہتی۔ کئی گاڑیاں تو ایسی ہیں جن میں مَیں عرصے سے سفر کرتا رہا ہوں، لیکن مجھے نہ ان کا نمبر معلوم ہے نہ یہ علم ہے کہ یہ اَپ ہیں یا ڈاؤن۔

بعض اوقات میرے دوست آپس میں کچھ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ ”تو آپ فور ٹین اَپ سے تشریف لائیں گے؟ میں اسٹیشن پر انتظار کروں گا۔“

”جی ہاں، لیکن اگر وہ نہ مل سکی تو سیون اَپ سے آجاؤں گا۔ بعض اوقات نائن اَپ تھری ڈاؤن کو لیٹ کرادیتی ہے۔ جس سے سیون اَپ بھی لیٹ ہو جاتی ہے۔ بہر حال آپ ٹو نٹی ڈاؤن نکلنے کے بعد ہی فور ٹین اَپ پر میرا انتظار کریں۔ اگر اس سے نہ پہنچ سکا تو پھر۔۔۔۔“

اور میں حسرت بھری نگاہوں سے ان کے چہروں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ بعض اوقات اپنی حالت پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتا ہوں۔

دوسرے یہ کہ میرا حافظہ بہت کمزور ہے اور میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ ابھی سوچ رہا ہوں، ابھی بھول جاتا ہوں۔ بعض اوقات تو سوچنے سے پہلے ہی بھول جاتا ہوں۔ اور اکثر اس قسم کے حادثے ہوتے رہتے ہیں۔۔۔

مجھے ایک صاحب سے ملایا جا رہا ہے۔ ان کا نام خلیل صاحب ہے۔ وہ مجھ سے پہلے بھی کبھی ملے ہیں لیکن میں حسبِ معمول بھول چکا ہوں۔ وہ ملتے ہی کہتے ہیں۔ ”میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔“

”ضرور دیکھا ہو گا۔“ میں مُسکرا کر کہتا ہوں۔

"بتاؤں کہاں دیکھا تھا؟"

"بتایئے!"

"آپ کرکٹ کا میچ کھیل رہے تھے۔"

اب میری باری آتی ہے اور اخلاقاً مجھے بھی کہنا پڑتا ہے کہ "اوہ! خوب یاد آیا۔ میں نے بھی آپ کو کہیں دیکھا ہے۔"

"کہاں دیکھا تھا؟"

"وہ اس روز آپ وہاں۔۔۔۔" میں اس امید پر کہتا ہوں کہ شاید وہ خود فقرہ مکمل کر دیں گے۔

"ہاں ہاں!" وہ چہک کر کہتے ہیں۔

"آپ وہاں، اس روز، اس وقت۔۔۔۔۔۔"

"ہاں فرمایئے میں کیا کر رہا تھا بھلا؟"

"آپ فاختہ اُڑا رہے تھے۔" میں تنگ آ کر کہتا ہوں۔

بہر حال تین چیزیں تو میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں۔ یہ مجھے کبھی یاد نہیں رہتیں۔ ایک تو مجھے ٹیلیفون کے نمبر یاد نہیں رہتے۔ دوسرے دوستوں کے پتے ہمیشہ بھول جاتا ہوں اور تیسرے۔۔۔لا حول ولا۔۔۔۔ دیکھئے میں پھر بھول گیا۔ میں وہ تیسری چیز بھول گیا ہوں جو اکثر بھول جاتا ہوں۔

قصّہ حاتم طائی بے تصویر

اے صاحبو! داستان گو یوں بیان کرتا ہے کہ افواہ ہے کہ کسی زمانے میں کسی جگہ کوئی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کے عدل و انصاف کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر روز صبح نو بجے اپنے سامنے شیروں اور بکریوں کو ایک گھاٹ پر پانی پلاتا تھا۔ اس کا لڑکا طائی اور وہ اس قدر حاتم تھا کہ سب اسے حاتم طائی کہتے تھے۔ بعض اوقات لوگ غلطی سے اسے حاتم تائی بھی کہہ بیٹھتے تھے۔

حاتم اس قدر رحم دل تھا کہ وہ شکار کے سلسلے میں سارا دن جانوروں کے پیچھے بھاگتا رہتا۔ اور آخر میں انہیں پکڑ کر چھوڑ دیتا۔ انہیں کچھ نہ کہتا بلکہ ان سے اپنے اس رویّے کی معافی مانگتا۔

حاتم ہر روز اپنی سلطنت میں ننگوں کو کھانا کھلاتا، بھوکوں کو کپڑے پہناتا اور معذور محتاجوں کی شادیاں کراتا۔ حاتم نے مخبر چھوڑ رکھے تھے۔ جب تک سارا شہر کھانا نہ کھا چکتا حاتم ایک لقمہ نہ اُٹھاتا۔ اس لیے وہ دوپہر کا کھانا رات کو کھاتا اور رات کا کھانا اگلی دوپہر کو۔

وہ خود اوصافِ حمیدہ کا مالک تھا۔ چہرہ چندے آفتاب، چندے ماہتاب، مثلِ گُلِ خنداں، مثلِ ماہ تاباں، ژولیدہ مُو۔

حاتم نے کچھ ایسی طبیعت پائی تھی کہ جہاں کسی حسین چہرے کو دیکھتا، فوراً ہزار جان سے عاشق ہو جاتا۔ یہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

انہی دنوں دربار میں ایک سیاہ پوش بزرگ کا طوطی بڑے زوروں سے بولتا تھا۔ اُمرا تو ایک طرف، بادشاہ خود ان سے ڈرتا تھا۔ طوطی سے بھی اور بزرگ سے بھی۔

جب بزرگ دربار میں تشریف لاتے (وہ ہر روز آتے تھے) تو بادشاہ استقبال کے لیے اُٹھتا اور زمین چھُو کر کہتا۔ "پیر و مرشد کے قدموں کی خاک عرقِ گلاب میں حل کر کے بطور سرمہ استعمال کروں گا تو نزلہ زکام کو فائدہ ہو۔"

بزرگ مُسکراتے اور دربار میں بیٹھ کر عبادت شروع کر دیتے۔ درباری اور بادشاہ چُپ چاپ بیٹھے رہتے، حتیٰ کہ دربار برخاست ہو جاتا۔ حاتم دل ہی دل میں جھنجلاتا کہ یہ کیا مصیبت ہے۔ اسے یہ بزرگ دونوں آنکھوں نہ بھاتے لیکن وہ مجبور تھا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔

ایک روز خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک شہزادی معہ اپنے لاؤ لشکر کے شاہی مہمان خانے میں اُتری۔ وہ تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے ساحل کی طرف جا رہی تھی۔ شہزادی نے بزرگ سیاہ پوش کو جھروکے سے دیکھا اور ترس کھا کر اپنی انّا سے بولی۔ ''دنیا مثلِ حباب کے ہے اور اس کا بیٹھنا معمولی ہے۔ یہ بزرگ بہت دُور پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ کبھی فرصت کے وقت خوب اپنی آنکھیں ان کے قدموں میں ملوں۔''

انّا نے کہا۔ ''ضرور!'' یہ سن کر شہزادی نے پیغام بھجوایا کہ ''اے بزرگ بے مثال! اگر میرے حقیر ناچیز سیاہ خانے کو اپنے مبارک جوتوں سے روشن کرو تو کمترین کو بے داموں مول لے لو اور یہ فدوی دونوں جہان میں سرخرو ہو۔'' بزرگ نے دعوت قبول کی اور تشریف لائے۔ شہزادی نے محل کو فرشِ مکلّف اور مسندِ شاہانہ سے آراستہ کیا۔ خوانِ زر و جواہر معہ طاؤس مرصع سامنے رکھا۔ زربفت کے دستر خوان پر جڑاؤ سنگِ پشت کے برتنوں میں انواع و اقسام کے کھانے چُنے اور بعد میں گنگا جمنی چلمچی اور آفتابے سے ہاتھ دھلوائے۔ بزرگ رخصت ہوئے، شہزادی کے ملازم دن بھر کے تھکے ہوئے تھے۔ انہوں نے سونے سے پہلے اپنے گھوڑے بھی بیچ دیئے اور جہاں تک پاؤں پھیلا کر سو سکتے تھے سو رہے۔

بزرگ سیاہ پوش دن میں سب ساز و سامان دیکھ چکے تھے۔ ان کی رال ٹپک رہی تھی۔ وہ رومال سے مُنہ پونچھتے رات کو چپکے سے نکلے۔ اپنے چالیس چور ساتھ لیے اور شاہی مہمان خانے کا رُخ کیا۔ وہاں انہوں نے ہیرے جواہرات کو ہاتھ نہ لگایا۔ سوچا کہ چوری میں شمار ہو گا۔ باقی کوئی چیز نہ چھوڑی۔ علی الصبح شہزادی اُٹھ کر کیا دیکھتی ہے کہ سارے محل میں جھاڑو پھری ہوئی ہے، یہاں تک کہ اونٹوں کے کجاوے اور گھوڑوں کی زینیں بھی غائب ہیں۔ شہزادی نے دربان کو جا دبوچا اور طیش میں آکر بولی۔ ”او نمک مرچ حرام! تو نے چور کو کیوں نہیں پکڑا؟“

دربان نے مؤدبانہ عرض کی۔ ”چور تو بھاگ گیا۔ اب یہ ہی سہی۔ یہ ان بزرگ سیاہ پوش کی لنگوٹی ہے۔“

شہزادی فوراً سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو یہ اسی سیاہ پوش کی شرارت ہے۔ وہ فریادی بن کر سیدھی شادی محل میں پہنچی۔ بادشاہ اس وقت شیو کر رہا تھا۔ فریادی نے مجرا کیا، ٹھمری گائی، دُعا دی اور ملتجی ہوئی کہ ”جہاں پناہ آپ کا یہ سیاہ پوش بزرگ میرے سامان پر ہاتھ صاف کر گیا۔ خدا اس کا مُنہ کالا کرے۔“

بادشاہ یکلخت چراغ پا بلکہ لالٹین پا ہو گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ تھوڑی دیر تک کانپتا رہا پھر چلّا کر بولا۔ ”نادان لڑکی ایسے بزرگ پر تہمت لگاتی ہے۔ وہ خود میرا

قلمدان اور روغن مونچھ اُٹھا کر لے گیا۔ لیکن میں نے تہمت نہیں لگائی۔ جا دفعہ ہو جا اور آئندہ مجھے پیٹھ بھی نہ دکھانا۔"

شہزادی نے پندرہ بیس فرشی سلام کئے اور بولی۔ "حضور چور پر تہمت لگانے میں کیا مضائقہ ہے؟"

بادشاہ نے تاؤ کھایا اور تین چار قلابازیاں کھا کر کہا۔ "ارے کوئی ہے؟ ذرا لانا میری چھڑی۔" اتفاق سے نوکر چاکر سب باہر گئے ہوئے تھے۔ شہزادی موقع شناس تھی۔ سمجھ گئی کہ اب عتابِ شاہی نازل ہونے والا ہے۔ مفت میں پِٹ جاؤں گی۔ فوراً بولی۔ "میں تو مذاق کر رہی تھی، میں اپنی تہمت واپس لیتی ہوں۔"

"ہم بھی اپنا عتاب واپس لیتے ہیں۔" بادشاہ نے مُسکرا کر کہا۔ "اور ساتھ ہی تمہیں خلعتِ فاخرہ سے سرفراز کرتے ہیں۔ آج کل خزانہ خالی ہے۔ فصلیں کٹنے پر اور روپیہ آنے پر خلعت بنوا دی جائے گی۔ ناپ بھجوا دینا یا یوں کرنا کہ خلعت اپنے پاس سے بنوا کر بِل شاہی خزانے بھیج دینا۔"

شہزادی آداب بجالائی اور رخصت ہوئی۔

حاتم کو سب علم تھا کہ کس کی شرارت ہے۔ پھر بھی وہ اپنی رحمدلی کی وجہ سے خاموش تھا۔

ایک روز اس کا گزر شاہی مہمان خانے سے ہوا۔ دیکھتا کیا ہے کہ شہزادی مغموم بیٹھی ہے اور اس کی انّا پاس بیٹھی چٹ چٹ بلائیں لے رہی ہے۔ حاتم اپنے تئیں شمعِ حُسن کے پاس پروانہ وار دیکھ کر آتشِ عشق بھسم ہو گیا اور حسبِ معمول ہزار جان سے عاشق ہو گیا (شہزادی پر)۔ شہزادی نے اس کی جانب دیکھا اور حاتم آہ سرد کھینچ کر بولا۔ ؎

ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے نہ دیکھو مجھ کو

میری آنکھوں میں نہ آجائیں تمہارے آنسو

شہزادی شرما کر بولی۔ ؎

ڈبڈبا آئیں خود بخود آنکھیں

بارہا ایسا اتفاق ہوا!

حاتم اس مرتبہ آہِ گرم کھینچ کر بولا۔ ؎

کون یہ دیکھ سکے ہے کہ حسین روتا ہے

ہو بناوٹ کا بھی رونا تو قلق ہوتا ہے

"اچھا اب صاف صاف بتاؤ کہ تمہیں کس نے ستایا ہے؟"

شہزادی بولی۔ "فلک نے، کہ چرخ اس کا تخلّص ہے اور چال اس کی ٹیڑھی ہے اور روزِ اوّل سے اسے نبادات، جمادات، چرند، پرند سب سے خدا واسطے کا بیر ہے۔" اتنے میں انّا نے پھر بلائیں لیں۔

حاتم بولا۔ "فلک کو بدنام مت کرو۔ فساد کی جڑ بلکہ فساد کا تناوہ سیاہ پوش ہے۔ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پرسوں اتوار کو وہ ناہنجار تمہارا سامان بازار میں نیلام کر رہا ہے۔ میں انشاء اللہ ضرور اس کی خبر لوں گا۔ اور ہاں اپنی انّا سے کہو کہ کچھ کام بھی کیا کرے کیونکہ سوائے بلائیں لینے کے اور نصیحتیں کرنے کے اس نے عمر بھر کوئی کام نہیں کیا۔"

چنانچہ اتوار کو وہ موذی پکڑا گیا اور کیفرِ کردار کو پہنچا۔ لیکن اس واقعے سے حاتم کا دل اس قدر کھٹّا ہوا کہ اس کا عشق بھی اُڑنچھو ہو گیا۔ اس نے دل میں ٹھان لی کہ اب یہاں رہنا بیکار ہے۔ چلنے سے پہلے وہ در و دیوار، گلیاں، کوچے سب سے لپٹ لپٹ کر ہنسا اور چل کھڑا ہوا۔ صحرا بہ صحرا، جنگل بہ جنگل، بگولے کی طرح منزلیں مارتا ہوا کہیں کا کہیں جا نکلا۔ ایک صبح اس کا گزر ایسے بیابان سے ہوا جو

اس قدر اُجاڑ تھا کہ وہاں اُلّو بھی نہیں تھے۔ ایک جگہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک دُبلا پتلا اور نحیف و نزار نوجوان بیٹھا بھوں بھوں رو رہا ہے اور بار بار یہ شعر زبان پر لاتا ہے۔ ؎

عشق نے غالب نکمّا کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ دیکھ کر حاتم کا دل بھر آیا اور وہ بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ جب دل کا غبار نکال چکا تو بولا۔ "اے جوانِ رعنا! تو اس بیابان میں کہاں؟"

نوجوان نے ایک مرتبہ شعر پھر پڑھا اور بولا۔ "اے راہ گیر اپنی راہ لے تجھ سے سینکڑوں آئے اور چلے گئے۔ ستائے ہوؤں کو کیوں ستاتا ہے؟ تجھ کو بھی محبّت کہیں ایسا نہ بنا دے۔"

حاتم بولا۔ "یار بڑا افسوس ہے۔ جہاں اِتنوں کو اپنی کہانی سنائی ہے وہاں ہم نے کونسا گناہ کیا ہے جو ہمیں نہیں سناتا۔"

نوجوان پر اس تقریر کا بہت اثر ہوا۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولا۔ "میں شہزادہ کبابِ شامی ہوں۔ ویسے صاحبِ دولت اور امیر کبیر ہوں لیکن اب بالکل حقیر ہوں۔ ایک ماہ رُو کے پنجۂ زلف میں اسیر ہوں، لکیر کا فقیر ہوں۔"

حاتم بولا۔ "وہ ماہِ رُو کہاں ہے؟ بوڑھی ہے یا جوان ہے؟ اور کسی پر مہربان ہے؟ ہمّت نہ ہار ہرگز جب تک تن میں جان ہے۔"

یہ سُن کر نوجوان نے کچھ اس طرح آہ و بکا شروع کی کہ پتھر منجمد ہونے شروع ہو گئے۔ حاتم سے نہ رہا گیا۔ اور وہ اس سے گلے مل کر رونے لگا۔ جب دونوں خوب سیر ہو کر رو چکے تو نوجوان بولا۔ "اس ماہ لقا زہرہ جبیں کا نام شہزادی غلام حسن بانو ہے۔ اس جیسا سنگدل نہ غالباً کوئی پیدا ہوا ہے، نہ انشاء اللہ ہو گا۔ مجھ سے لاکھوں نوجوان اس نے گھائل کئے ہیں۔ جو جاتا ہے اس سے سات سوال پوچھتی ہے۔ وہ سوال اتنے مشکل ہیں کہ آج تک کوئی انہیں حل نہ کر سکا۔ یہی وہ غم ہے جسے میں گھُن کی طرح کھائے جا رہا ہوں۔ نہ میں رات کو جاگ سکتا ہوں نہ دن کو سو سکتا ہوں۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد ہوں۔" یہ کہہ کر شہزادہ چکرایا۔

حاتم فوراً بولا "نہ نہ بھئی، غش نہ کھانا۔ میں تیری مشکل حل کر دوں گا۔ تو مجھے شہزادی کا مفصّل پتہ دے دے۔"

نوجوان اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ مُسکرایا۔ اس نے فوراً پتہ لکھوا دیا اور بولا۔ "میں تیرا منتظر رہوں گا۔ میں دن بھر تو صحرا میں آوارہ گردی کرتا ہوں۔ رات

کو ابو بیزار بصری کی سرائے میں قیام کرتا ہوں۔ اے میرے محسن، تو مجھے وہیں ملیو۔ خدا کرے تو کامیاب ہو اور مجھے شربتِ دیدار نصیب ہو۔"

"اتنی دیر تو شربتِ روح افزا اور شربتِ فولاد ملا کر پیجو۔" حاتم بولا اور وہاں سے چل کھڑا ہوا۔

حاتم تھوڑی دور گیا ہو گا کہ اسے ایک سفید براق شبیہ نظر آئی۔ یہ سفید پوش بزرگ تھے۔ ان کے چہرے پر سفید بال نقاب کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر کے بال چہرے سے اُٹھائے۔ حاتم کو بغور دیکھا۔ پہلے ہنس پڑے، پھر رو دیئے۔

حاتم بزرگ کو دیکھ کر پہلے رویا پھر ہنس پڑا۔

حاتم نے سبب پوچھا۔ بزرگ بولے "میں ہنسا اس لیے کہ ایسا جوان دلیر و باصفا نظر آیا۔ اور رویا ہوں کہ تو خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کرتا پھر رہا ہے۔"

بزرگ نے سبب پوچھا۔ "حاتم گویا ہوا۔ میں رویا اس لیے کہ آپ مجھے ڈانٹیں گے اور ہنسا یوں کہ میں جس کام کے لیے نکلا ہوں وہ ضرور کر لوں گا۔ ہر گز باز نہ آؤں گا۔"

سفید پوش بزرگ بولے۔ ”تیری مرضی۔ تو ایک دن ضرور پچھتائے گا۔ اچھا اگر تجھے کہیں سُرخ پوش بزرگ ملیں تو ہمارا ایک پیغام پہنچا دیجو۔ ان سے کہیو کہ واہ بھئی واہ اچھے گئے۔ نہ خط نہ پتا، نہ کسی جِن کے ہاتھ خیریت کی خبر ہی بھیجی۔“ حاتم نے وعدہ کیا اور روانہ ہوا۔ راستے میں اس نے لاتعداد مخلوق کی مدد کی۔ ایک شخص ڈوب رہا تھا۔ حاتم نے فوراً ایک تنکا پھینکا لیکن تنکا ڈوبتے ہوئے شخص تک نہ پہنچ سکا۔ حاتم نے خود چھلانگ لگائی۔ ابھی اس شخص تک پہنچا ہی تھا کہ کنارے پر ایک چیخ بلند ہوئی۔ حاتم اسے چھوڑ کر فوراً واپس لپکا اور دیکھا کہ ایک ریچھ ایک شخص کی مرمت کر رہا ہے۔ حاتم اس شخص کی مدد کرنے ہی لگا تھا کہ جھاڑیوں سے ایک آہ سنائی دی اور حاتم اس طرف متوجہ ہوا۔ غرضیکہ اسی طرح منزلیں طے کرتا ہوا شہزادی غلام حسن بانو کے شہر تک جا پہنچا۔ اپنا حلیہ درست کر کے محل کا رُخ کیا اور نقارے پر اس زور سے ضرب لگائی کہ سارا محل گونج اٹھا۔ ایک حبشی دوڑا دوڑا آیا اور سلام کر کے بولا۔ ”میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

حاتم نے اپنا مطلب بیان کیا۔

حبشی نے کہا۔ ”کیا نام بتایا آپ نے؟ حاتم تائی؟“

حاتم ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”جی نہیں تائی نہیں طائی۔۔۔ طائی۔“

حبشی نے پھر پوچھا۔ ”ت سے یا ط سے؟“

حاتم چیخ کر بولا۔ ”ط سے طبلے کی ط سے۔“

حبشی نے اندر خبر پہنچائی۔ فوراً پردہ کرایا گیا اور حاتم کو فوراً اندر بلا لیا گیا۔ پردے کے دوسری طرف سے شہزادی کی آواز آئی۔ ”معاف کیجئے، پیشتر اس کے کہ باقاعدہ ساتوں سوال آپ کو بتائے جائیں، میں کچھ زبانی امتحان لینا چاہتی ہوں۔ کیا میں چند سوال آپ سے پوچھ سکتی ہوں؟“

حاتم نے کہا۔ ”بصد شوق پوچھئے۔“

شہزادی بولی۔ ”پہلا سوال یہ ہے کہ شطرنج میں اگر بادشاہ پر گھوڑے سے شَہ دی گئی ہو، وزیر مر چکا ہو، بادشاہ سے چھ خانے دُور ایک پیدل ہو اور گھوڑے کے پیچھے ایک اور گھوڑا ہو، اس کی بغل میں ایک فیل ہو اور اس کے آگے رُخ، تو شَہ کسی طرح بچیں گے؟“

حاتم بولا ”اس کا جواب یہ ہے کہ نہ میں شطرنج کھیلتا ہوں، نہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی ہے۔“

شہزادی کی آواز آئی۔ ”بہت خوب! دوسرا سوال یہ ہے کہ قیامت کے متعلق آپ کے کیا خیالات ہیں؟“

حاتم بولا ”پہلے قیامت دیکھ لوں پھر بتاؤں گا۔“

شہزادی بولی۔ ”بالکل درست۔ اچھا تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر تین ہزار پانچ سو تین کو، چھ ہزار تین سو دو سے ضرب دی جائے تو کیا آئے گا؟“

”آٹھ ہزار تین سو تین!“ حاتم فوراً بولا۔

شہزادی بولی۔ ”اہرامِ مصر کا وزن کیا ہو گا؟“

حاتم ”تول کر بتایا جا سکتا ہے۔“

شہزادی ”آپ زبانی امتحان میں کامیاب ہوئے۔ اب آپ کل پورے نو بجے یہاں تشریف لے آیئے تاکہ آپ سے اصلی سوال پوچھے جائیں۔“

اگلے روز حاتم اللہ کا نام لے کر محل میں پہنچا۔ وہاں اسے پورے نو بجے ایک پرچہ دیا گیا۔ پرچے پر مندرجہ ذیل عبارت مرقوم تھی:

پرچہ امتحان سالانہ حاتم طائی

سب سوال ضروری ہیں۔ وقت کی کوئی قید نہیں۔ نمبر خفیہ۔ نقل کرنے یا کسی سے پوچھنے کی سخت ممانعت ہے۔ اگر پکڑے گئے تو کمرۂ امتحان سے خارج کر دیئے جاؤ گے۔

1. ”ایک بار کھایا ہے۔ دوسری بار کھانے کی ہرگز ہوس نہیں ہے“ سے کیا نتیجہ نکال سکتے ہو بیان کرو۔

2. ”شادی کر اور دریا میں ڈال“ کو صاف طور پر واضح کرو۔

3. ”کسی سے نیکی مت کر۔ اگر کرے گا تو تیرے سامنے آئے گی۔“ یہ بیان غلط ہے یا صحیح؟ اس پر روشنی ڈالو۔

4. ”مسخرے کو ہمیشہ راحت ہے۔“ پر جواب مضمون لکھو۔

5. کوہ ہمالیہ کی خبر لاؤ۔ کوہ سے ہوا آتی ہے، اس کی وجہ تسمیہ بیان کرو۔

6. مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھو۔ حمام، باد گرد اور حجّام آوارہ گرد۔

7. پریکٹیکل امتحان۔ ایک موتی کے برابر انڈہ لاؤ (موتی دکھا دیا جائے گا)

حاتم نے پرچہ بڑے غور سے پڑھا تا کہ سب سے آسان سوال پہلے شروع کرے۔ کئی مرتبہ پڑھنے کے بعد حاتم نے سوچا کہ موجودہ ترتیب درست ہے۔ چنانچہ وہ پہلے سوال کے جواب کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ دریاؤں اور سمندروں کو عبور کرتا ہوا کہیں سے کہیں جا نکلا۔ ایک جگہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک فلک بوس

مینار سامنے کھڑا ہے۔ حاتم نے جب مینار کی چوٹی کو نظر اُٹھا کر دیکھا تو اس کی پگڑی گِر پڑی۔ حاتم نے لا حول پڑھی، جیب سے آئینہ نکالا اور پگڑی باندھنے لگا۔ اتنے میں پری زادوں کا ایک غول گزرا۔ حاتم پگڑی اور آئینہ چھوڑ چھاڑ کر ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جلدی سے ان سب میں سے حسین ترین چہرہ منتخب کیا اور اس پر ہزار جان سے عاشق ہوا۔ ایک موڑ پر وہ غول او جھل ہو گیا۔ حاتم دیوانہ وار چاروں طرف دوڑنے لگا۔ اتنے میں زور کا دھماکہ ہوا۔ جب حاتم بغیر لخلخے کے ہوش میں آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ نہ مینار ہے، نہ پری زاد۔ حاتم ایک شہر کے چوک میں ہے اور چاروں طرف اُونٹ ہی اُونٹ کھڑے ہیں۔ جگہ جگہ یہ عبارت آویزاں ہے "اپنے اُونٹ یہاں پارک کیجئے۔" ایک جگہ جلّی الفاظ میں لکھا ہے۔ "عرب میں اونٹوں کی چوریاں بڑھتی جا رہی ہیں لہٰذا اپنے اُونٹ کو قفل لگائیے اور چابی اپنے پاس رکھئے۔" حاتم فوراً سمجھ گیا کہ وہ عرب میں ہے۔ وہ ایک اُونٹ والے کی طرف بڑھا اور بولا۔ "اُونٹ خالی ہے؟"

"جی نہیں! یہ پرائیویٹ اُونٹ ہے اور قاضی ابوالہول صاحب کا ہے۔" جواب ملا۔

حاتم نے دوسرا اُونٹ کرائے پر لیا۔ جب سوار ہونے لگا تو اُونٹ بولا۔ "کیا آپ کا سفر واقعی ضروری ہے؟"

حاتم نے متعجّب ہو کر کہا۔ ”قسم ہے اس پاک پروردگار کی جس نے اٹھارہ ہزار قسم کے جانور پیدا کیے۔ آج پہلی مرتبہ اُونٹ بولا ہے!“

”فضول گفتگو سے پرہیز کیجئے۔“ اُونٹ نے کہا۔ ”میرے سوال کا جواب دیجئے۔“

”ہاں ضروری ہے۔“ حاتم بولا۔

تِس پر اُونٹ بولا۔ ”بسم اللہ، دل ما روشن چشم ما شاد، قدِما دراز شوق فرمایئے۔“

حاتم سوار ہوا۔ ابھی تھوڑی دور ہی گیا ہو گا کہ اُونٹ والے نے صدا لگائی۔ ”چلو بھئی ایک سواری جبل الشاعر کی۔“

”دیوانہ ہوا ہے۔“ حاتم نے جھلّا کر کہا۔ ”ہم نے سالم اُونٹ کیا ہے۔“

”معاف کیجئے۔“ ساربان بولا۔ ”ویسے ہی مُنہ سے نکل گیا تھا۔“

شام ہو چکی تھی اور اندھیرا ہو چلا تھا۔ حاتم نے دیکھا کہ اُونٹ کچھ ترچھا چلتا ہے۔ ٹھوکریں بھی کھاتا ہے۔ حاتم نے وجہ پوچھی تو ساربان نے کہا۔ ”صاحب اس کی بینائی کمزور ہے۔“ حاتم کا دل بھر آیا۔ بولا ”آئے ہائے تو پھر اس کی آنکھوں کا معائنہ کرا کے عینک کیوں نہیں لگوا دیتا۔“

"ایک مرتبہ لگوائی تھی لیکن اس کے چہرے کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ عینک ٹھہرتی نہیں، پھسل جاتی ہے۔ ایک دفعہ دھوپ کا سیاہ چشمہ بھی خریدا تھا۔"

"تو پھر مقوی بینائی اصل بغدادی سرمہ اس کی آنکھوں میں لگایا کر۔" حاتم نے مشورہ دیا۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ایک سپاہی نے اُونٹ کو ٹھہرالیا اور اُونٹ کا نمبر پوچھنے لگا۔ ساربان بولا۔ "میرا قصور؟"

سپاہی نے کہا۔ "ارے گیدی، بغیر روشنی کے اُونٹ چلاتا ہے اور پھر قصور پوچھتا ہے۔ ٹھہر تو سہی ابھی چالان کرتا ہوں۔"

حاتم نے سوچا کہ یہ غریب مفت میں مارا جائے گا چنانچہ اس نے فوراً جیب سے کچھ نکال کر دیا اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

ساربان حاتم کی اس سخاوت پر اس قدر شاداں ہوا کہ گڑگڑا کر بولا۔ "اے میرے محسن مجھے کاروبارِ لائقہ سے مطلع فرما۔"

حاتم بولا۔ "میں اس شخص کی تلاش میں ہوں جو یہ کہتا پھرتا ہے کہ ایک بار کھایا ہے دوسری بار کھانے کی ہرگز ہوس نہیں ہے۔"

ساربان بولا۔ "میرے خیال میں آپ ملک چین تشریف لے جایئے۔ وہاں کے باشندے عجب اوٹ پٹانگ چیزیں کھاتے ہیں۔ وہاں آپ کو گوہر، مقصود ملے گا۔"

چنانچہ حاتم نے چین کا رُخ کیا اور اس کی مراد بر آئی۔ وہ واپس شہزادی غلام حسن بانو کے محل پر پہنچا۔ وہاں اس نے زور سے نقارہ بجایا۔ پردہ کرا کے حاتم کو اندر بلایا گیا۔ شہزادی نے پردے کی اوٹ سے مزاج پوچھا۔ حاتم بولا "شکریہ! میں بالکل اچھا ہوں۔ فقط ذرا ساز کام ہے۔" اس کے بعد اپنی رام کہانی یوں سنائی۔

"میں چین میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ آخر ایک روز ایک سرائے میں اُترا۔ کھانے کے وقت نوکر ایک فہرست لایا۔ جس میں کھانوں کے نام درج تھے۔ میں چینی زبان بالکل نہ سمجھ سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے ویسے ہی فہرست پر ایک جگہ انگلی رکھ دی اور اشارہ کیا کہ یہ لے آؤ۔ ذرا سی دیر میں وہ ایک قاب بھُنے ہوئے گوشت کی لایا۔ جس کو اس خاکسار نے بڑی رغبت سے کھایا لیکن سیر نہ ہوا۔ چنانچہ اشاروں میں کہا کہ اور لاؤ۔ وہ سمجھ نہ سکا۔ چونکہ میرے خیال میں وہ گوشت مرغ کا تھا اس لیے میں نے تنگ آ کر مرغ کی نقل اتار دی اور کہا 'ککڑوں کوں!' اور ساتھ ہی قاب کی طرف اشارہ کیا۔ وہ پھر بھی نہ سمجھا۔ میں نے قاب کو چھوا اور پورے زور سے کہا۔ 'کڑوں کوں!' تِس پر اس نابکارے

قاب کی طرف اشارہ کیا اور بولا 'نہ نہ ککڑوں کوؤں نہیں بلکہ میاؤں میاؤں۔ میاؤں میاؤں۔" اتنے میں ایک شخص نے، جو سب کچھ دیکھ رہا تھا کہا۔ "صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی، یہ گوشت ککڑوں کُوں کا نہیں تھا بلکہ میاؤں میاؤں کا تھا۔ اور میں وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر ایسا بھاگا کہ پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ لہٰذا اے شہزادی! میں ہی وہ شخص ہوں جو نعرے لگاتا ہے کہ ایک بار کھایا ہے دوسری بار کھانے کی ہرگز ہوس نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر حاتم نے ایسا فلک شگاف اور زمین دوز نعرہ لگایا کہ سارا محل تھر تھر کانپنے لگا۔ ابھی دوسرا نعرہ لگانے ہی لگا تھا کہ شہزادی کانوں میں انگلیاں دے کر بولی۔ "ٹھیک ہے۔ پہلا سوال تمام ہوا۔"

حاتم وہاں سے رخصت ہو کر شہزادہ کبابِ شامی سے ملا جو بدستور بھوں بھوں رو رہا تھا۔ اسے تسلّی دے کر دوسرے سوال کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

حاتم چلتا چلتا ایک ایسے اونچے پہاڑ کے دامن میں پہنچا جو آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ حاتم کچھ دیر کھڑا باتیں سُنتا رہا۔ پھر سستانے کے لیے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ پتھر زور سے گھوما اور حاتم کو چکر آ گیا۔ جب ہوش آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ چاروں طرف محفل رقص و سرود گرم ہے۔ ایک صاحب بلند آواز سے بولے۔ "یہ عرب ہے۔ ابھی آپ نے جناب عمر عیّار صاحب کی ایک تقریر سُنی

تھی جس کا موضوع تھا 'قرونِ وسطی کے سماج میں اونٹوں کی اہمیت' اب زمرّد پری صاحبہِ بہاگ کا خیال شُبھ بلمپت درباری تین تالہ لَے میں ناچیں گی۔"

زمرد پری نے گانا شروع کیا۔ "چلو اے ری سکھی بیکانیر چلیں، جہاں پریم کی بنسی باجت ہے۔" حاتم اس گانے سے بہت متاثر ہوا۔

اس کے بعد۔۔۔ جانا حاتم کا بیکانیر اور سُننا پریم کی بنسی کا۔

واپسی پر حاتم کا گزر ایسے بیاباں سے ہوا جہاں ریت کے سوا کچھ نہ تھا۔ حاتم کئی روز کا بھوکا پیاسا تھا۔ تھک کر بیٹھ گیا اور دُعا مانگ کر سو گیا۔ خواب میں ایک زرد پوش بزرگ نظر آئے اور حاتم سے مخاطب ہو کر بولے۔ "اے مردِ مجاہد دہنی طرف دس گز کے فاصلے پر ایک پھاوڑا دفن ہے اسے کھود کر نکال لے۔ پھر اس سے بائیں طرف زمین کھود۔ وہاں گرم مسالہ، آٹا، تازہ سبزی، چولھا، دیاسلائی، لکڑیاں سب دفن ہیں۔ ان کو نکال کر اپنے استعمال میں لا۔ ویسے یہ سب کچھ دفن میں نے کیا تھا لیکن شکر تو بیشک خدا کا ادا کر دینا۔ جب کھانا تیار ہو چکے تو میرا انتظار کرنا۔ شاید میں تھوڑی دیر تک چکر لگا جاؤں۔"

حاتم نے سوچا کہ یہ عالمِ خواب ہے یا عالمِ بیداری۔ چنانچہ اس نے زور سے بزرگ کے چُٹکی بھری۔ وہ چلّا کر بولے۔ "اف مار ڈالا! حاتم یہ کیا کرتا ہے؟"

حاتم نے مؤدبانہ عرض کیا۔ "معاف فرمایئے۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میں سو رہا ہوں یا جاگ رہا ہوں۔" بزرگ کچھ پیار بھرے بول سُنانا چاہتا تھا کہ حاتم فوراً جاگ اٹھا۔ وہ اسی خواب کا منتظر تھا اور اس کو دیکھنے کے لیے سویا تھا۔

حاتم ساری رات زمین کھودتا رہا لیکن کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ تب حاتم نے سوچا کہ وہ بزرگ زرد پوش تو یونہی کوئی بوگس بزرگ نکلے۔

اگلے روز حاتم کا غنچۂ تمنّا کھل اٹھا اور اسے ایک ایسا شخص ملا جو بار بار کہتا تھا "شادی کر اور دریا میں ڈال۔" دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس شخص کی والدہ کو اپنے بیٹے کی شادی کا بہت چاؤ تھا۔ بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ لیکن اب والدہ خفا رہنے لگی کہ بیٹا زن مرید ہوتا جا رہا ہے۔ وہ بیٹے سے یہی کہتی کہ تو بیوی کی طرفداری کرتا ہے۔ اُدھر بیوی بھی خفا رہنے لگی اور کہتی کہ تو اپنی والدہ کی طرفداری کرتا ہے۔ معاملہ یہاں تک بڑھا کہ اس غریب کا دماغ چل گیا اور اب یہ چلّاتا پھرتا ہے کہ شادی کر اور دریا میں ڈال۔ بہت سے نوجوان اس ہدایت پر عمل بھی کرتے ہیں۔ یہ سن کر حاتم تیر کی طرح واپس پہنچا اور محل کے دروازے پر اتنے زور سے ڈھول بجایا کہ سب جاگ اٹھے۔ حاتم اندر چلا گیا لیکن فوراً ہی باہر بھیج دیا گیا۔ اور جب باقاعدہ پردہ ہو چکا تب اس کی رسائی ہوئی۔

سارا قصّہ سُن چکنے کے بعد شہزادی نے کہا۔ "درست ہے۔"

اس کے بعد حاتم سیدھا شہزادہ کباب شامی کے پاس پہنچا جو بھوں بھوں رو رہا تھا۔ حاتم جھلّا کر بولا۔ ”یار تو ہر وقت بھوں بھوں مت رویا کر، مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ رونے کی اور بھی کئی قسمیں ہیں!“

”مثلاً؟“

”مثلاً یہی کہ دھاڑیں مار مار کر رولیا کر۔“ اس کے بعد حاتم نے خوشخبری سنائی اور رخصت چاہی۔

حاتم ذرا سی دُور گیا ہو گا کہ ایک پری رُو کو دیکھ کر ہزار جان سے عاشق ہو گیا اور عقد کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن معلوم ہوا کہ ایک رقیب پہلے سے موجود ہے۔ حاتم اس سے جا کر ملا اور پوچھا۔ ”آپ اس پری رُو کو کس قدر چاہتے ہیں؟“

وہ رقیبِ روسیاہ بولا۔ ”جب سے میں نے اسے دیکھا ہے میں سو جان سے عاشق ہو گیا ہوں۔“

”اور یہ فقیر ہزار جان سے عشق ہے۔“ حاتم نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ رقیب ایسا خاموش ہوا جیسے اس نے سانپ سونگھ لیا ہو۔ ایک طویل وقفے کے بعد بولا۔ ”آپ جیتے اور میں ہارا۔ اب میں انشاء اللہ بہت جلد خودکُشی کروں گا اور اس عالمِ

جاودانی سے اُس عالمِ فانی کی طرف کوچ کر جاؤں گا۔ لیکن میں نے سُنا ہے آپ کسی ضروری کام سے نکلے ہیں۔ اور کوئی آپ کا منتظر ہے۔ حیف ہے کہ انسان اس قدر خود غرض ہو جائے کہ دوسروں کو نظر انداز کر دے۔"

حاتم چونک پڑا اور اسے فوراً شہزادہ کبابِ شامی یاد آ گیا۔ وہ آنکھوں میں آنسو لا کر بالا۔

"اے مردِ باعصمت و باعفّت و نیک خصلت! تیرا حق تجھی کو سونپا۔ تو جا اور اس عورتِ توانا، دلیر و باصفا و بامروّت کو عقد میں لا اور مجھے اجازت دے۔"

چنانچہ اسی روز عاشق و معشوق کی بڑی دھوم دھام سے شادی خانہ بربادی ہوئی اور حاتم وہاں سے چل پڑا۔ آگے جا کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک دیوانہ گریبان چاک کیے، بال پریشان کیے صحرا میں پریشان پھرتا ہے اور گھڑی دیکھ کر آدھ آدھ گھنٹے بعد چیخ کر کہتا ہے "کسی سے نیکی مت کر، اگر کرے گا تو تیرے سامنے آئے گی۔" حاتم نے باتوں باتوں میں وجہ پوچھی۔ دیوانے نے بتایا کہ "میں ایک بے حد عقلمند اور ضرورت سے زیادہ ذہین انسان تھا اور ایک بہت بڑی جائیداد کا مالک تھا۔ شہر سے دُور اپنے محل میں رہتا تھا۔ ایک روز صبح کیا دیکھتا ہوں کہ محل کے دروازے پر ایک کتّا زخمی پڑا ہے۔ مجھے ترس آ گیا۔ زخم دھو کر مرہم پٹّی کر دی۔ کتّا لنگڑاتا ہوا رخصت ہوا۔ دوسرے روز میری آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں کہ وہ

کتّا ایک اور زخمی کتّے کو لیے دروازے پر کھڑا ہے۔ میں بہت خوش ہوا۔ کتّے کی ذہانت کی داد دی اور مرہم پٹّی بھی کر دی۔ اگلے روز دیکھتا ہوں کہ چار زخمی کتّے میرے منتظر ہیں۔ اس سے اگلے روز آٹھ کتّے آئے اور اس سے اگلے روز سولہ کتّے اسی طرح یہ تعداد بڑھتی گئی حتیٰ کہ محل کے اندر اور باہر چاروں طرف کتّے ہی کتّے نظر آنے لگے۔ ایک روز میں اس قدر گھبرایا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ نکلا اور اب دنیا کو اس خطرے سے آگاہ کرتا ہوں کہ کسی سے نیکی مت کر، اگر کرے گا تو تیرے سامنے آئے گی۔" حاتم ہاتھ ملا کر روانہ ہوا اور شہزادی کو یہ قصّہ سنایا۔ یہ جواب بھی صحیح قرار دیا گیا۔ حاتم شہزادہ کبابِ شامی سے ملا جو اس دفعہ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ حاتم نے چمکارا اور تسلّی دی۔ اگلے روز حاتم نے کمر خوب زور سے باندھی اور چل پڑا۔

حاتم چلتا چلتا ایک نہایت خوشنما باغ کے دروازے پر پہنچا۔ سوچا کہ آج یہیں پڑاؤ ہو گا۔ ابھی ستا ہی رہا تھا کہ ایک حور شمائل نازنین نظر آئی۔ حاتم کو ایسا موقع خدا دے، فوراً ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ نازنین بے حد خفا ہوئی اور بولی کہ ابّا جان سے کہہ دوں گی۔ حاتم نے سینے پر ہاتھ رکھ کر حسبِ توفیق کئی عشقیہ شعر پڑھے۔

لیکن اس نے ابّا جان سے جا کر کہہ دیا جو جادوگروں کا اُستاد تھا۔ مگر حاتم اپنی اس ہٹ سے باز نہ آیا اور بدستور عاشق رہا۔ آخر کار جادوگر خود بہ نفسِ نفیس تشریف لایا اور حاتم کو بغور دیکھ کر اپنے چیلے سے بولا۔ "حاتم کو ایک غار میں بند کر کے اس کے مُنہ پر سنگِ خارا کی سِل رکھ دو۔"

"کِس کے مُنہ پر؟ وضاحت فرمائی جاوے۔" چیلا بولا۔

"غار کے مُنہ پر۔" جادوگر بھُنّا کر بولا۔

کئی روز تک حاتم غار میں بند رہا۔ جب باہر نکالا گیا تو بالکل چاق و چوبند تھا۔ اس کے بعد حاتم کو آگ پر جلانے کا پروگرام تھا۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ وہ "اسمِ حاتم" پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیتا تھا۔ آخر تنگ آ کر سمندر میں ڈبونے لگے۔ جب حاتم کو سمندر میں ڈبوتے تو سمندر کی سطح یکلخت اونچی ہو جاتی جب باہر نکالتے تو نیچی ہو جاتی۔ غرضیکہ اسی طرح کئی دنوں تک ہوتا رہا۔ آخر سب عاجز آ گئے۔ جادوگر بھی تھک گیا۔ حاتم کو خشکی پر لا کر چھوڑ دیا گیا تو اس نے نعرہ لگایا۔ "پانی! پانی!!" چنانچہ اسے پانی پلایا گیا۔ اور حاتم وہیں جم کر بیٹھ گیا۔ جادوگر نے پوچھا۔ "اب کیا ارادہ ہے؟"

حاتم بولا "بھوک ہڑتال کر رہا ہوں۔"

جادوگر تھر تھر کانپنے لگا اور گڑگڑا کر بولا۔ "خدا کے لیے یہ نہ کرنا ورنہ میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ کیا تجھے اور کوئی کام نہیں؟" یکایک حاتم کو اپنا کام یاد آگیا جس کے لیے یہ خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ وہ فوراً جادوگر سے بغل گیر ہو کر رخصت ہوا۔ ایک عرصے تک سڑکیں ناپتا پھرا اور آخر کار جواب لے کر شہزادی کے پاس پہنچا اور اپنا قصّہ یوں سنایا۔ "میں ایک شفاخانے میں مقیم تھا کہ برابر کے کمرے سے دو آدمیوں کی بات چیت سنائی دی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ ایک شخص قریب المرگ تھا اور بستر پر پڑا دم توڑ رہا تھا۔ دوسرا آدمی جو سو فیصدی مسخرا معلوم ہوتا تھا اس کے پاس بیٹھا تھا۔ گفتگو سے معلوم ہوا کہ دونوں کی تجارت میں برابر کے حصّہ دار ہیں۔ پہلا بولا۔ 'اے رفیقِ دیرینہ! مرتے وقت میں چند قصوروں کی معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں گنہگار ہوں، دغاباز ہوں اور مکّار ہوں۔ میں نے اس مشترکہ تجارت میں ایک لاکھ کا غبن کیا تھا۔ وہ جو ہر مہینے تجوری ٹوٹتی تھی اس میں میرا ہی ہاتھ تھا اور وہ جو گماشتوں کی ہر روز پٹائی ہوتی تھی وہ میرے اشارے پر ہوتی تھی۔ تمہارے گھر میں جتنی چوریاں ہوئیں سب میں نے کی تھیں، تمہارے جو سارے مویشی مَر گئے تھے وہ میں نے ہی۔۔۔۔!'

دوسرا آدمی بات کاٹ کر بولا۔ 'یار چھوڑو بھی۔ تم تو ناحق رنج کرتے ہو۔ یہ جو تمہیں زہر دیا گیا ہے یہ میں نے ہی تو دیا ہے۔' یہ کہہ کر وہ مسخرا مُسکرانے لگا۔ پس اے شہزادی اس سے ثابت ہوا کہ مسخرے کو ہمیشہ راحت ہے۔"

یہ سُن کر شہزادی ہنستے ہنستے بیہوش ہو گئی۔ فوراً لخلخہ سنگھایا گیا تب ہوش میں آئی اور بولی۔ ”اگرچہ اس قصّے کا تعلق میرے سوال کے ساتھ کچھ اتنا نہیں ہے۔ تاہم میں اس جواب پر پورے نمبر دیتی ہوں۔ یہ نمبر خوشخطی کے سمجھ لیجئے۔“

حاتم نے شکریہ ادا کیا اور رخصت چاہی۔

اگلے چاند حاتم پھر شہزادی کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا۔ ”پانچویں سوال کا جواب حاضر ہے۔ کوہ ہمالیہ دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہے اور ہندوستان کے شمال میں واقع ہے۔ جو ہوائیں بحیرہ عرب اور خلیج بنگال سے اُٹھتی ہیں۔ وہ بخارات سے لدی ہوئی کوہ ہمالیہ سے ٹکراتی ہیں اور خوب بارش ہوتی ہے۔ ہوا چلنے کی وجہ تسمیہ یہی ہے۔“

”مرحبا؟“ شہزادی پردے کی اوٹ سے بولی۔ ”بالکل صحیح جواب ہے۔“

دروازے پر حاتم کو حبشی غلام ملا۔ وہ مردِ سیاہ بولا۔ ”جان کی امان پاؤں تو ایک سوال پوچھوں؟“

حاتم نے نہ صرف جان بخشی بلکہ سوال کی اجازت بھی دے دی۔ وہ مردِ نامعقول بولا۔ ”اس مرتبہ آپ جواب کہاں سے لائے؟ ہر روز تو میں آپ کو شہر میں دیکھتا تھا۔“

حاتم نے کہا۔ ”قسم کھا کسی کو نہیں بتاؤ گے۔“ حبشی نے قسم کھائی۔ حاتم بولا ”میں کوہ ہمالیہ کہاں گیا تھا۔ یہ جواب جغرافیہ کی کتاب سے پڑھ کر بتایا ہے۔“

یہ کہہ کر حاتم شہزادہ کبابِ شامی سے ملا جو اس مرتبہ چنگھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ حاتم نے خوشخبری سنائی اور کہا۔ ”بھئی اب تو یہ رونا پیٹنا بند ہی کر دے تو اچھا ہو۔ میں تھکا ہارا آتا ہوں اور تو اس طرح میرا استقبال کرتا ہے کہ میں بیزار ہو جاتا ہوں۔“

اگلے روز اتوار تھا۔ اس لیے حاتم نے چھٹی منائی، حمام کیا، انواع و اقسام کے کھانے کھائے اور پیر کو چھٹے سوال کے لیے چل دیا۔ ابھی تھوڑی سی مسافت طے کی ہو گی کہ اسے روک لیا گیا۔

آنا ایک شہسوار کا ساتھ پیغام کے اور روکنا حاتم کو کہنا کہ شہزادی واپس بلاتی ہے کیونکہ حجام آوارہ گرد مل گیا ہے۔

حاتم واپس پہنچا تو شہزادی نے کہا۔ "میں معافی چاہتی ہوں۔ حجام آوارہ گرد حمامِ باد گرد ہی میں مِل گیا۔ اب آپ جلدی سے پریکٹیکل کیجئے۔ یہ امتحان بہت طویل ہوتا جارہا ہے۔" یہ کہہ کر شہزادی نے اپنی انّا کے ہاتھ ایک بہت بڑا موتی بھیجا جسے حاتم نے اچھی طرح دیکھا اور پوچھا۔ "کیا میں اسے اپنے ساتھ لے جاسکتا ہوں تاکہ مجھے اتنا بڑا انڈہ تلاش کرنے میں آسانی رہے۔"

شہزادی کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ "میرے خیال میں آپ یہ موتی یہیں چھوڑ جایئے۔ میں اس کے برابر ایک انڈہ منگوائے دیتی ہوں اور آپ وہ ساتھ لے جایئے۔ اور خُدارا یہ نہ سمجھئے کہ مجھے آپ پر اعتبار نہیں۔"

حاتم نے مُسکرا کر کہا۔ "خیر کوئی مضائقہ نہیں۔"

ذرا سی دیر میں موتی کے برابر انڈہ حاتم کے حوالے کیا گیا۔ حاتم نے محل سے نکلتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ انڈے کو اُبال لیا کہ خراب نہ ہونے پائے پھر اس پر طرح طرح کے رنگ پھیرے۔ اگلے چاند حاتم یہ انڈہ لے کر محل میں پہنچا اور بولا "یہ لیجئے! یہ انڈہ مور کا ہے۔" شہزادی بولی۔ "آپ کا یہ جواب بھی ٹھیک ہے۔ کل آپ سے چند مزید زبانی سوالات پوچھے جائیں گے اور پرسوں نتیجہ سنا دیا جائے گا۔"

حاتم نے کہا۔ ”لیکن آپ کو ذرا سی تبدیلی کرنی ہو گی۔ امیدوار کا نام بدلنا ہو گا۔ کیونکہ امیدوار میں نہیں ہوں میرا دوست شہزادہ کبابِ شامی ہے۔“

شہزادی بولی۔ ”اچھا تو یہ بات ہے۔ مجھے پہلے ہی سے شبہ تھا۔ بھلا وہ کماتا کیا ہے؟“

حاتم نے بتایا۔ ”بس شہزادہ ہے۔ کمانا وماناکیا تھا۔ میں بھی تو شہزادہ ہی ہوں۔“

شہزادی بولی۔ ”تو کیا ہوا؟ نتیجے سے پہلے میں آپ سے بھی یہی سوال کرتی کہ آپ کیا کماتے ہیں۔ امیدوار کو کسی اعلیٰ اور مستقل ملازمت میں ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ بالکل ناکامیاب ہے۔“ یہ سُن کر حاتم کا خون کھولنے لگا اور شوں شوں کی آواز آنے لگی۔ وہ اٹھ کر واپس جانے لگا تو شہزادی بولی۔ ”یا وحشت! اب کیا ارادہ ہے؟“ حاتم نے کہا۔ ”اگر زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ اپنے دوست کے لیے اعلیٰ اور مستقل ملازمت تلاش کر کے دکھاؤں گا۔ آپ اس وقت تک نتیجہ شائع مت کیجئے۔“ حاتم یہ کہہ کر چل دیا۔ راستے میں وہی سفید ریش بزرگ ملے۔ انہوں نے سفید بالوں کا نقاب چہرے سے اُٹھایا اور بولے۔ ”حاتم کہاں جاتا ہے؟“ حاتم نے قصّہ سنایا۔ وہ بولے۔ ”دیوانہ ہوا ہے؟ عشق کا ملازمت سے کیا تعلق؟ حاتم بھلا تو اپنا وقت کیوں ضائع کرتا پھر رہاہے۔ اس وقت تیرا شغل ہے

عاشق ہونا اور کام ہے ڈنڈے بجانا۔ کیوں سچ ہے نا؟" اور حاتم نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "ہاں چس ہے۔"

"اچھا تو جا اپنا کام کر۔ شہزادہ کبابِ شامی کو میں سنبھال لوں گا۔ کیا تو نے شہزادی کے ابّا سے بھی بات چیت کی تھی؟" بزرگ نے پوچھا۔

"نہیں تو؟"

"لاحول ولا قوۃ! تو پھر تو اب تک کیا کیا ہے؟ بھلے مانس اس کے ابّا سے مل کر سب طے کر لیتا اور قضیہ ختم ہوتا۔ اچھا تو جا۔ آئندہ اپنا وقت ضائع نہ کرنا۔ تیرے دوست کا بندوبست میں کروں گا۔ وعدہ رہا۔"

"اس کے بعد آپ کا پروگرام کیا ہو گا؟" حاتم نے مؤدبانہ دریافت کیا۔

"اس کے بعد کہ بقیہ عمر لندن یا پیرس میں جا کر یادِ خدا میں بسر کر دوں۔" بزرگ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے۔ حاتم نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور رخصت ہوا۔

اپنے ملک میں پہنچ کر حاتم بہت پریشان ہوا کہ ناحق اتنا وقت ضائع کیا اور مفت میں پریشان ہوا۔ اس نے سلطنت بھر میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ آئندہ کوئی لڑکی اس قسم کی اوٹ پٹانگ سوال نہ کرے اور شادی کے سلسلے میں ہمیشہ لڑکی کے ابّا سے بات چیت کی جائے اور جو لڑکے عاشق ہونا چاہیں وہ ضرور بضرور کسی اعلیٰ اور مستقل ملازمت میں ہوں ورنہ عاشق ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سُنا ہے کہ وہاں اب تک اس پر عمل کیا جاتا ہے۔

الحمدللہ کہ ایں نسخہ لاجواب، یعنی قصّہ حاتم طائی بے تصویر، بخیر وعافیت تمام شُد۔ دروغ بر گردنِ دریائے راوی۔

ٹُرپ چال

"ٹُرپ چال!" شیطان بولے۔

بڈّی (Buddy) اور میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ بڈّی نے آنکھ ماری اور پوچھا۔ "روفی کیا بجا ہے؟"

"چار بجے ہیں، پتّے ڈالو۔" وہ بولے۔

"کیسی اچھی گائے جا رہی ہے سڑک پر۔۔۔!" میں نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی دیکھتا ہوں، تم پتّے ڈالتے جاؤ۔"

"اے روفی! یہ کون ہے صوفے کے پیچھے؟" بڈّی گھبرا کر چلّایا۔

شیطان نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور ہم دونوں نے فوراً پتّے ملا لیے۔

"لعنت ہے! تم کھیلتے ہو یا روتے ہو۔" شیطان نے پتّے پٹخ دیئے اور تاؤ کھا کر بولے۔ "اچھا اس بے ایمانی کی سزا یہ ہے کہ نکالو روپے!"

"یار یہ تو جُوا ہو گیا۔"

"نہیں جُوا نہیں۔ برِج کی ایک قسم ہے۔" شیطان نے کہا۔

میری جیب میں گنتی کے روپے تھے۔ اُدھر بڈّی بھی غالباً مفلس تھا۔ ہم دونوں نے بڑے عجز سے کہا۔ "اُدھار رہے۔"

مختصر سی بحث کے بعد شیطان بیزار ہو کر اٹھے اور چاء کے سلسلے میں ضروری احکامات صادر کرنے چلے گئے۔

شیطان، بڈّی اور میں تاش کھیل رہے تھے۔ یہ کھیل ہمارا ایجاد کردہ تھا۔ کٹ تھروٹ اور پیس کوٹ کو جمع کر کے دو پر تقسیم کر دیا تھا۔ اکثر شرطیں لگتی تھیں اور اکثر میں اور بڈّی ہارتے تھے۔

بڈّی ایک موٹا تازہ ہنس مکھ امریکن تھا جو اتفاق سے ہمیں سینما میں مل گیا اور بہت جلد گہرا دوست بن گیا۔ وہ کئی سال سے ہندوستان میں تھا۔ ہندوستانی کھانوں پر عاشق تھا۔ کبھی کبھی ہم اسے آڑی ٹوپی، شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنا کر مشاعروں میں لے جایا کرتے۔

بڈّی ہر دوسرے تیسرے روز ملنے آتا۔ آتے ہی فوراً چار سوال پوچھا۔ یہ سوال اس قدر باقاعدہ اور مستقل تھے کہ کبھی ان میں ایک حرف کی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

پہلا سوال: ”آج کیا پکا ہے؟“

دوسرا سوال: ”کوئی تازہ خبر؟“

تیسرا سوال: ”شہر کی بہترین پکچر کون سی ہے؟“

چوتھا سوال: ”میں پہلے سے کچھ موٹا تو نہیں ہو گیا؟“

اس کے بعد کم از کم ایک اور زیادہ سے زیادہ کئی دلچسپ واقعات سناتا۔ ہم چائے پینے لگے۔ بڈّی بولا۔ ”ایک دفعہ ایک سپاہی کا کورٹ مارشل ہو گیا۔ اس نے گھر خط لکھتے وقت غالباً اس کا ذکر کر دیا۔ گھر سے خط آیا تو لکھا تھا۔ برخوردار! خوش رہو۔ کورٹ مارشل کے متعلق پڑھا۔ دل کو از حد خوشی حاصل ہوئی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے یہ دن دکھایا۔ اب ہماری یہ دعا ہے کہ تم بہت جلد فیلڈ مارشل بن جاؤ۔“

پھر ایک سارجنٹ نئے رنگروٹوں کو پریڈ کرا رہا تھا۔ اس نے سب کو ایک قطار میں کھڑے ہونے کے لیے کہا۔ قطار سیدھی نہ بنی۔ وہ بگڑ گیا اور چلّا کر بولا۔

”نالائقو! اسے قطار کہتے ہو؟ سب کے سب جلدی سے یہاں دوڑ کر آؤ اور دیکھو کہ کیسی ٹیڑھی اور ترچھی قطار ہے۔' خیر نئ قطار بنی۔ سارجنٹ نے کہا اپنے دائیں پاؤں ہوا میں اٹھاؤ۔ سب نے اپنا دایاں پاؤں اٹھا دیا۔ ایک رنگروٹ نے غلطی سے بایاں پاؤں اٹھا دیا اور قطار میں ایک جگہ دائیاں اور بایاں پاؤں اکٹھے ہو گئے۔ سارجنٹ زور سے چیخا۔ یہ کون گدھا ہے جو دونوں پاؤں ہوا میں اٹھائے کھڑا ہے۔؟“

”ایک اور۔۔۔۔۔“ شیطان نے فرمائش کی۔

”ہمارے ہاں ایک بہت ہی مشہور شخص گزرا ہے۔“ بڈّی بولا۔ ”اس قدر مشہور کہ میں اس کا نام بھول گیا ہوں۔ وہ بیحد مسخرا تھا۔ نوّے برس کی عمر میں بھی وہ بچّوں کی طرح اچھلتا کودتا پھرتا۔ ایک مرتبہ پارٹی میں اس نے نہایت حسین لڑکی دیکھی جسے سب بے تحاشا گھور رہے تھے۔ وہ کچھ دیر ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر ٹھنڈا سانس بھر کر بولا۔ ‘کاش کہ آج میں نوّے کی بجائے ستّر برس کا ہوتا‘۔“

اب بڈّی نے شیطان سے ان کے جدید رومان کے متعلق دریافت کیا۔

”آج کا دن کیسا رہا؟ گئے تھے اُن کے ہاں؟“

"ہاں گیا تو تھا لیکن کیا بتاؤں؟ کولہو کے تیلی کی طرح ہوں، یعنی ترقّی صفر ہے۔ ادھر اس لڑکی کا خیال مجھ پر تسمۂ پیر کی طرح سوار ہے۔ اور اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے وہ غیر فانی اور مشہور و معروف تصویر یاد آتی ہے جو غالباً میں نے کہیں دیکھی تھی۔ بس یہ سمجھ لو کہ مجھے ان دِنوں محبّت سے محبّت ہوتی جا رہی ہے اور نفرت سے سخت نفرت ہو گئی ہے۔"

"لیکن پچھلے ہفتے تو تم بالکل بھلے چنگے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہاں میں صرف اس منگل سے عاشق ہوا ہوں۔ اور بُری طرح عاشق ہوا ہوں۔ خدا ایسا وقت کسی دوست کو بھی نہ دکھائے۔ مصیبت یہ ہے میری مالی حالت نہایت مخدوش ہے۔ یہاں تک کہ اگر میں لڑکی ہوتا تو اپنے آپ کو بھی پسند نہ کرتا۔"

"اگر ہم لڑکی ہوتے تو تمہیں پسند کر ہی لیتے۔"

"خوش رہو بڈّی بس تمہاری یہی باتیں تو ہمیں پسند ہیں۔ اچھا اب لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دو کہ شادی اور بچّوں کے متعلق تمہارے کیا خیالات ہیں؟"

"شادی کے متعلق تو میں ایک لفظ نہیں کہوں گا، رہ گئے بچّے، سو مجھے پرندوں، بچّوں اور جانوروں سے سخت نفرت ہے۔"

"کیا سب جانوروں سے یا کسی خاص جانور سے؟"

"سب سے۔"

"تو گائے بھینسوں سے بھی نفرت ہے؟"

"یقیناً!"

"لیکن دودھ کا تو تمہیں بیحد شوق ہے۔"

"لیکن میں تو ٹین کا دودھ استعمال کرتا ہوں۔"

"ٹین کا دودھ بھی تو گائے بھینسوں ہی کا ہوتا ہے۔ ابھی تک مشینوں نے دودھ دینا شروع نہیں کیا؟"

"واقعی؟" بڈّی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کمال کرتے ہو، ڈبے کے اوپر گائے کی تصویر جو ہوتی ہے۔"

"تصویروں کا کیا ہے؟" بڈّی نے اپنی جیب سے کیمل سگریٹ کا پیکٹ نکال کر کہا۔ "یہ دیکھئے اس پیکٹ میں اُونٹ استعمال نہیں کیا گیا اور نہ ہی ان سگرٹوں کا اُونٹ سے کوئی تعلق ہے۔"

"چھوڑو کیا قضیہ لے بیٹھے۔ یہ بتاؤ رونی، کیا واقعی معاملہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ نوبت شادی تک آ پہنچی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں" شیطان بولے۔ "لیکن وہ لوگ مجھے ذرا خاطر میں نہیں لاتے۔"

"تو تم ایم اے پاس کیوں نہیں کر لیتے؟" بڈّی بولا۔

"اب کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن اس وقت ایم اے ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ سروس کا ملنا ضروری ہے۔ مجھے عرصے سے محکمۂ جنگلات پسند ہے۔ میرے خیال میں وہاں کوشش کی جائے۔"

"کیا تنخواہ ہو گی؟"

"پانچ سو روپے۔ روٹی کپڑا۔" شیطان بولے۔

"لیکن تم درخواست پر لکھو گے کیا؟ کوئی خاص سند تو ہے نہیں نہ کوئی تجربہ ہے۔"

"یہ لکھیں گے کہ جنگلات سے محبّت ہے، درختوں کو پہچان سکتا ہوں، درختوں پر چڑھ سکتا ہوں، انہیں اُکھاڑ سکتا ہوں، کاٹ سکتا ہوں اور جنگلات میں کافی پھرا ہوں۔ کیا یہ کافی نہیں؟"

"کیا واقعی تم سنجیدہ ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تو اور کیا مذاق کر رہا ہوں۔ افسوس ہے!"

"لیکن طبّی معائنہ بھی تو ہو گا۔"

"ہوتا رہے۔"

"میرا مطلب ہے تمہاری بینائی ذرا۔۔۔!" میں نے ان کے موٹے شیشوں والی عینک کی طرف اشارہ کیا۔

"تو آنکھوں کا معائنہ کرائے لیتے ہیں۔ کل سہی۔" شیطان بولے۔

فیصلہ یہ ہوا کہ کل معائنہ ہو اور اس کے بعد محکمۂ جنگلات میں درخواست بھیجی جائے۔

میں علی الصبح ساڑھے دس بجے اٹھا اور شیطان کو کچّی نیند سے جگایا۔ طے ہوا کہ ڈاکٹر شاید صاحب کو فون کر کے ملنے کا وقت پوچھا جائے۔ فون کیا آواز آئی۔ "زور سے بولیے۔"

شیطان زور سے بولے۔ آواز آئی۔ ”اور زور سے بولیے۔“ یہ اور زور سے بولے۔ پھر آواز آئی۔ ”اور بھی زور سے بولیے۔“ شیطان چلّا کر بولے۔ ”قبلہ اگر اس سے بھی زیادہ زور سے بول سکتا تو پھر ٹیلیفون کی کیا ضرورت تھی۔“

اَب اس طرف سے ایک کھُسر پھُسر قسم کی تقریر سنائی دی۔ شیطان تنگ آکر بولے۔ ”صاحب! جب تک آپ خاموش رہتے ہیں مجھے سب کچھ صاف صاف سنائی دیتا ہے لیکن جب آپ بولنا شروع کرتے ہیں تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔“

اتنے میں پتہ چلا کہ ٹیلیفون غلط نمبر پر کیا ہے اور دوسری طرف سے ڈاکٹر قبل از مسیح بول رہے ہیں (ان کا طریقۂ علاج قدیم یونانی اور رومن طِب کے مطابق تھا)۔ وہ ہمارے واقف تھے، غالباً ڈانٹ رہے تھے۔ شیطان نے جلدی سے کہا۔ ”میں کچھ علیل سا ہوں۔“ انہوں نے علامتیں پوچھیں۔ شیطان کو جتنی علامتیں یاد تھیں سب بتادیں۔ اُدھر سے آواز آئی۔ ”تم غذا کا خاص خیال رکھو۔ ہفتے تک ایسی ہلکی غذا کھاؤ جو ایک برس کا بچّہ بھی بخوبی ہضم کر سکتا ہو۔“

اس کے بعد ڈاکٹر شاید صاحب کو فون کیا گیا۔ جواب ملا خود آکر پہلے وقت لیجئے، پھر معائنہ ہو گا۔

اگلے روز ان کی کوٹھی کارُخ کیا۔ راستے میں ڈاکٹر قبل از مسیح مل گئے۔ شیطان کا حال پوچھنے لگے۔ یہ بولے اب بہتر ہوں۔

''میں نے تمہیں ایک برس کے بچّے کی غذا کھانے کو کہا تھا تم نے کھائی؟''

''جی ہاں کھائی۔''

''کیا کھایا تھا؟''

''تھوڑی سی مٹّی، ایک بٹن، نارنگی کا چھلکا، سگرٹوں کے کچھ ٹکڑے، ایک شیشے کی گولی۔۔۔۔'' اور ڈاکٹر صاحب زار و قطار ہنسنے لگے۔

ڈاکٹر شاید کے ہاں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ آج وہ کسی سے نہیں ملیں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر پہنچے۔ یہی جواب ملا۔ ہم نے بھی بار بار حملے کئے، آخر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور ہمیں اندر بلالیا۔

شیطان نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ وہ بولے۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ آج میں سات ملاقاتیوں کو بغیر ملے واپس بھیج چکا ہوں۔''

''جی ہاں معلوم ہے! وہ ساتوں ملاقاتی میں ہی ہوں۔ میں سات مرتبہ آیا تھا۔'' شیطان بولے۔

اس کے بعد معائنہ شروع ہوا۔ شیطان کی عینک اُتار لی گئی۔ اور وہ میر اسہارا لے کر کھڑے ہوئے ورنہ شاید گر ہی پڑتے۔

"سامنے دیکھئے اور آخری حرف پڑھیے۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"کون سا حرف؟" شیطان متعجب ہو کر بولے۔

"آخر سطر کا آخری حرف۔"

"کون سی سطر؟"

"اس تختے کی آخری سطر۔"

"کون سا تختہ؟"

"سامنے کی دیوار پر ٹنگا ہوا تختہ۔"

"کون سی دیوار؟" شیطان نے حیران ہو کر پوچھا۔

اور معائنہ ختم ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھ دیا کہ شیطان کی بینائی اس قدر کمزور ہے کہ اسے ہرگز بینائی نہیں کہا جا سکتا۔

شام کو بڈّی آیا۔ آتے ہی اس نے پوچھا۔: کیا پکا ہے؟" بتایا شامی کباب اور میٹھے ٹکڑے۔"

بڈّی کی رال ٹپکنے لگی۔ بولا "کوئی تازہ خبر؟"

اسے شیطان کے طبّی معائنہ کے متعلق بتایا۔

تیسرے سوال کا یہ جواب دیا گیا۔ "طوفانی گھوڑا" عرف "بدنصیب بلّی" شہر کی بہترین پکچر ہے۔ اب آخری سوال تھا۔ موٹاپے کے متعلق۔ سو اسے یقین دلایا گیا وہ ہرگز زیادہ موٹا نہیں ہوا جتنا موٹا تھا اتنا ہی ہے۔

اس کے بعد چاء کا دور شروع ہوا۔

"آج بسکٹ کچھ سخت ہیں۔" میں نے ایک بسکٹ چباتے ہوئے کہا۔

"واقعی؟" شیطان بولے۔ "یہ بسکٹ اتنا سخت ہے کہ اگر بڈّی کے سر پر مارا جائے تو بسکٹ ٹوٹ جائے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" بڈّی بولا۔

"اور آج کا دلچسپ واقعہ؟"

''کوئی خاص نیا واقعہ تو نہیں۔ البتہ پچھلے سال جب میں کلکتہ میں تھا تو میرے پڑوس میں چار گدھے بندھتے تھے جو عین چار بجے بولتے تھے اور اس قدر باقاعدگی سے بولتے تھے کہ ان کی آواز پر میں اپنی گھڑی درست کیا کرتا۔''

''تو آج کل تو وہاں صرف تین گدھے ہو گئے ہوں گے۔'' شیطان بولے۔ بڈّی کچھ شرما گیا۔ ''آسام میں بارش بہت ہوتی ہے۔ جب میں وہاں تھا تو چراپونجی کے پاس مجھے ایک شخص ملا۔ میں نے باتوں باتوں میں پوچھا کہ یہاں سال میں کتنے انچ بارش ہوتی ہے؟'' وہ بولا ''صاحب یہ تو پتہ نہیں، میں چالیس برس کا ہوں۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے یہاں بارش ہو رہی ہے۔''

''دارجیلنگ بھی گئے تھے تم؟'' میں نے پوچھا۔

''بھلا وہاں کا طلوعِ آفتاب میں کیونکر بھول سکتا ہوں۔'' بڈّی بولا۔

''میرے خیال میں دنیا کا بہترین طلوعِ آفتاب سندھ کا غروبِ آفتاب ہے۔'' شیطان نے کہا۔

''تم نے دارجیلنگ کا طلوعِ آفتاب دیکھا؟'' بڈّی نے پوچھا۔

''میں نے آج تک کوئی طلوعِ آفتاب نہیں دیکھا۔'' شیطان بولے۔ ''مصیبت یہ ہے کہ طلوعِ آفتاب دیکھنے کے لیے ایسے وقت اُٹھنا پڑتا ہے جب سورج نکل رہا

ہو۔ ایسے وقت اُٹھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ میں نے نصف النہار آفتاب اکثر دیکھا ہے یا پھر غروبِ آفتاب۔"

"لوگ کہتے ہیں کہ دارجیلنگ کافی سرد مقام ہے لیکن میں تو صرف ایک قمیض پہنے وہاں پھرتا رہا۔" بڈّی نے فخر سے کہا۔

"تمہارا کیا ہے؟ تم نے چربی کا اوور کوٹ جو پہن رکھا ہے۔" شیطان بولے۔

"میں ایک پوستین بلوچستان سے لایا تھا جس کے خوب لمبے لمبے بھورے بال ہیں۔جی چاہتا ہے اسے پہنا کروں۔" بڈّی نے کہا۔

"خدا کے لیے وہ پوستین کہیں تم نہ پہن بیٹھنا۔ شہر بھر کے کتّے پیچھے لگ جائیں گے۔"

بڈّی کو شیطان کے عشق کی بیچارگی پر افسوس آرہا تھا۔ یہ خیال ہمیں اداس کیئے دیتا تھا کہ اگر بہت جلد کوئی انتظام نہ کیا گیا تو محبوبۂ شیطان کو کوئی اور لے جائے گا۔

آخر بڈّی بولا۔ "یہ سروس وغیرہ سب فضول باتیں ہیں۔ کم از کم ہمارے ملک میں تو لوگ ملازمت کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ متعلقہ انسان کو دیکھتے ہیں۔ تم کسی طرح اس کُنبے میں ہر دلعزیز ہو جاؤ۔ ان پر اس طرح چھا جاؤ کہ وہ تمہارے نام

کی مالا جپنے لگیں۔ اپنی محبّت صرف لڑکی پر ظاہر کرو، ہر ایک سے مت کہتے پھرو، سوائے ہم دونوں کے۔ یہ مت کرو کہ کاگوں ہاتھ سندیسے اور چڑیوں ہاتھ سلام ۔(یہ محاورہ ان محاروں میں سے تھا جو ہم نے بڈّی کو یاد کرائے تھے۔ بڈّی نے آج پہلی مرتبہ ایک محاورہ صحیح مقام پر استعمال کیا تھا) ورزش کیا کرو، ہلکی غذا کھاؤ، علی الصبح اُٹھا کرو، وٹامنز پھلوں اور سبزیوں کا استعمال جاری رکھو اور یقین کر لو کہ تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔"

بڈّی کا یہ نسخہ واقعی تیر بہدف اور آزمودہ قسم کا معلوم ہوتا تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اسے ضرور آزمایا جائے گا۔

اگلے روز سے شیطان نے بڑے زور شور سے ان کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ بڈّی نے مشورہ دیا کہ اگر کوئی رقیب میدان میں ہو تو اسے پٹوا دیا جائے۔ پٹنے کے لیے کئی حضرات منتظر تھے۔ ان کی خدمات ہمارے لیے وقف تھیں۔ ایک تو ہمارے پلے ہوئے دوست رستم علی ریچھ تھے اور دوسرے لومڑی چند جڑاؤ۔ ان کا نام کچھ اور تھا لیکن وہ لومڑی سے ملتے جلتے تھے اور جڑاؤ اس لیے کہ انہوں نے اپنے چہرے پر بے شمار کیل مہاسے اور نہ جانے کیا کیا الا بلا کاشت کر رکھی تھی۔

مصیبت یہ تھی کہ کوئی رقیب بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور ان لوگوں کا یہ ارادہ تھا کہ کسی مناسب لڑکے کی تلاش میں عمر گزار دیں گے لیکن شیطان کو داماد نہ بنائیں گے۔

بڈّی کا اصرار تھا کہ پہلے لڑکی کے ابّا کو مسخّر کیا جائے۔ خواہ کسی عمل یا چِلّے سے خواہ بات چیت سے۔ اسی سلسلے میں شیطان ہر روز ان کے گھر میں نازل ہوتے اور ان بزرگ کو ورغلاتے۔

ایک شام کو ہم دونوں وہاں پہنچے۔ بزرگ بولے۔ ''لڑکو! اگرچہ چاء کا وقت تو نہیں رہا لیکن اگر کہو تو منگواؤں؟''

''جی ہاں، ضرور۔'' شیطان بولے۔ میں نے میز کے نیچے سے ایک ٹھوکا دیا۔

''یہ تم کیوں مجھے مار رہے ہو؟'' شیطان نے زور سے کہا۔

چاء پر باتیں شروع ہوئیں۔ بزرگ ریلوے بجٹ کا ذکر کر رہے تھے۔ خدا جانے انہوں نے کیا کیا کہا۔ کیونکہ مجھے ریلوے سے تھوڑی بہت دلچسپی ضرور ہے لیکن بجٹ سے ذرا دلچسپی نہیں۔ میں نے کچھ نہ سنا۔ شیطان بڑھ بڑھ کر بول رہے تھے۔ آخر بزرگ نے اخبار کو دیکھ کر کہا کہ اس سال بجٹ اتنے کروڑ اتنے لاکھ

اتنے ہزار چار سو ننانوے روپے پانچ آنے نو پائی آیا ہے۔ "اس کے متعلق تمہارے کیا خیالات ہیں برخوردار؟"

شیطان کچھ دیر سوچ کر بولے۔ "میرے خیال میں بجٹ میں دس آنے تین پائی جمع کر دینے چاہئیں تاکہ آنے پائیوں سے نجات ملے اور ہندسے مکمل ہو جائیں۔"

بجٹ کے متعلق گفتگو وہیں ختم ہو گئی۔ ورزش کا ذکر چھڑا۔ بزرگ بولے۔ "اس عمر میں مَیں بھاگ دوڑ تو نہیں سکتا۔ البتہ سائیکل چلا لیتا ہوں۔ اس سے اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔"

"موٹر میں بیٹھنے سے بھی کافی ورزش ہوتی ہے۔" شیطان نے کہا۔ "اور ریل کی سواری سے تو خوب ورزش ہو جاتی ہے۔"

بزرگ خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک کوئی نہ بولا۔ آخر تنگ آ کر میں نے شیطان سے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

وہ بولے۔ "یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم اس حقیقت کو بالکل بھول چکے ہیں کہ ہم ایک ستارے پر آباد ہیں۔"

اس مرتبہ بزرگ نے ایسا برا مُنہ بنایا کہ میں نے سوچا اب یہ چھینک ماریں گے۔ ریڈیو پر مقامی اسٹیشن سے کوئی گانا نشر ہو رہا تھا۔ بزرگ کہنے لگے۔ ”بالکل فضول گانا ہو رہا ہے۔ نہ جانے ایسے گویّوں کو گانے کی اجازت کون دیتا ہے۔“

شیطان فوراً اٹھے۔ ”ابھی بند کرواتا ہوں۔“ میں بھی اُٹھا۔ ساتھ والے کمرے میں گئے۔ ریڈیو اسٹیشن کو فون کیا۔ ”اس وقت کون گا رہا ہے؟“

”اس وقت جناب مست مولا صاحب تابڑ توڑ بھیم سین بھنگ کا خیال دھوم دھام دھر پد میں الاپ رہے ہیں۔“ کچھ اس قسم کا ادھر سے جواب آیا۔

”تو ان سے کہہ دیجیے کہ فوراً چپ ہو جائیں۔“ شیطان نے کہا۔

”ہم آئندہ پروگرام دیتے وقت اس بات کا خیال رکھیں گے کہ آپ ان کا گانا پسند نہیں کرتے لیکن اس وقت کچھ نہیں کر سکتے۔“

”یقین جانیے ہمیں بے حد ناگوار محسوس ہو رہا ہے۔“

”آپ کچھ دیر کے لیے ریڈیو بند کر لیجیے۔“

”اور آپ اپنے مست قلندر کو چُپ نہیں کرائیں گے؟ اچھا اگر یہ بات ہے تو تیّار ہو جائیے، میں ابھی آ کر خبر لیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر ٹیلیفون بند کر دیا۔

جب ہم واپس آ رہے تھے تو میں نے اپنی حقیر رائے کا اظہار کیا کہ بزرگوں کے سامنے شیطان کو قدرے انسانیت سے کام لینا چاہیے۔ لیکن شیطان کا خیال تھا کہ چونکہ میرا تجربہ ابھی محدود ہے اس لیے خیالات بھی محدود ہیں۔

واپس کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ لاتعداد مچھر اور انواع واقسام کے بھُنگے اور پتنگے بلب کے گرد جمع ہیں۔

شیطان بولے۔ "میں ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جن پر مچھر، بھڑیں، تتئیے، مکھّیاں وغیرہ بُری طرح فریفتہ ہیں اور جہاں وہ جاتے ہیں یہ چیزیں اگر کئی میل کے فاصلے پر بھی ہوں فوراً استقبال کے لیے آتی ہیں۔"

مچھروں نے ہمیں عاجز کر دیا۔ تنگ آ کر ہم نے روشنی بجھا دی لیکن مچھروں کی بھنبھناہٹ بدستور رہی۔ اتنے میں اتفاق سے ایک جگنو بھی اُڑتا ہوا کمرے میں آ گیا۔

"دیکھی تم نے ان بے ایمان مچھروں کی شرارت۔" شیطان بولے۔ "اب یہ مشعل لے کر مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔"

ہم دونوں جگنو کے پیچھے پڑ گئے۔ اس کا ارادہ باہر جانے کا قطعاً نہ تھا۔ ہم نے زبردستی اسے باہر بھگایا۔ مسہریوں میں بھی مچھر پہنچ چکے تھے۔ شیطان بولے۔

"مسہری استعمال کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے مسہری خوب اچھی طرح لگا لو۔ اس کے بعد ایک طرف سے کچھ حصّہ اُوپر اٹھادو اور کچھ دیر اُٹھائے رکھو تا کہ کمرے بھر کے مچھر مسہری میں چلے جائیں۔ اس کے بعد مسہری بند کر دو اور باہر سو جاؤ۔"

اگلے روز بڈّی آیا اور آتے ہی اس نے چاروں سوال پوچھے۔ میں نے اور شیطان نے تہیّہ کر لیا تھا کہ آج بڈّی کی باتوں پر ہرگز نہیں ہنسیں گے۔

بڈّی بولا۔ "میں نیویارک کے ایک مشہور ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ رات گئے کسی نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کھولا تو دیکھتا کیا ہوں کہ ایک شخص نشے میں مدہوش کھڑا ہے۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ 'معاف کیجئے، غلطی ہوئی۔' میں دروازہ بند کر کے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جا کر دیکھتا ہوں تو وہی شخص کھڑا ہے۔ معافی مانگ کر چلا گیا۔ تیسری بار پھر آیا، چوتھی بار، پانچویں بار، آخر میں جھلّا اُٹھا۔ اس دفعہ جو وہ آیا تو میں نے پوچھا۔ 'کیوں صاحب آپ بار بار میرے ہی کمرے میں کیوں آتے ہیں؟' اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ہوٹل کے ہر کمرے میں مجھے آپ ہی کیوں ملتے ہیں؟"

ہم دونوں خاموش رہے۔ بڈّی نے ہمارے ہنسنے کا چند سیکنڈ انتظار کیا۔

"میں واشنگٹن کے ایک چڑیا گھر کی سیر کر رہا تھا کہ مجھے ایک شخص دکھائی دیا جو بیشمار بچّوں کو ساتھ لیے پھر رہا تھا۔ گنے تو بارہ بچّے تھے۔ ہم اس احاطے کے باہر ملے جس میں زیبرا بند تھا۔ وہ شخص چوکیدار کے پاس گیا اور بولا۔ 'کیا میں اور میرے بچّے سب اندر جا کر زیبرا دیکھ سکتے ہیں؟' چوکیدار کچھ دیر بُت بنا کھڑا رہا۔ پھر بولا۔ 'تو آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں اندر سے زیبرے کو بلا کر لاتا ہوں تاکہ وہ آپ کو دیکھ لے'۔"

اس پر شیطان بسورنے لگے اور رو دیئے۔ اب بڈّی سمجھ گیا کہ ہم اس کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ اسے منانا پڑا۔

"بڈّی کیا بجا ہے؟"

"میری گھڑی آگے ہے۔"

"پھر بھی کیا بجا ہو گا؟"

"گھڑی بہت آگے ہے!"

"تین چار دن تو آگے نہیں ہو گی۔" شیطان بولے۔

کھانے کے بعد محبوبۂ شیطان کا ذکر چھڑ گیا۔

"آخر تم لڑکی سے خود کیوں نہیں ملتے؟" بڈّی نے پوچھا۔

"اس لیے نہیں ملتا کہ اگر کہیں اس نے ہاں کر دی تو مصیبت آ جائے گی۔ اس کے ابّا لازمی طور پر انکار کریں گے اور پھر میں کچھ کر گزروں گا۔"

"لیکن تمھیں لڑکی کی ہاں پر کیا اعتراض ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم منتظر کس بات کے ہو۔ اس انتظار میں ہو کہ کب لڑکی کی شادی کسی اور سے ہوتی ہے اور کب تمھیں نجات ملتی ہے۔ کیوں؟"

"اور جو لڑکی نے کہیں نہ کر دی تو پھر اس کے ابّا کی ہاں بیکار ہو گی۔ اگر دونوں نے نہ کر دی تو بڑی کوفت ہو گی۔" شیطان نے کہا۔

"تمہارا فلسفہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" بڈّی بولا۔ "بہر حال میں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ تم اس کے ابّا سے ملتے رہا کرو۔"

اگلے روز ہم نے دوپہر کے وقت ان کی کوٹھی کا رُخ کیا۔ ابھی سڑک پر ہی تھے کہ اندر سے کسی بچّے کے رونے کی آواز سنائی دی۔

"آہاہا! دوپہر کے کھانے سے پہلے ہلکی پھلکی موسیقی ہو رہی ہے۔" شیطان بولے۔

اندر گئے تو وہاں کسی مکان کا ذکر ہو رہا تھا۔ یہ لوگ مکان بدلنا چاہتے تھے۔ سہ پہر کو مکان دیکھنے کا پروگرام تھا۔ ہمیں بھی مدعو کیا گیا۔ یہ مکان دریا کے کنارے پر تھا۔

شیطان بولے۔ "میں نے سُنا ہے کہ دریا کے کنارے پر جو مکان ہوں ان کی عمر ایک سال سے زیادہ نہیں ہوتی بلکہ شاید اس سے پہلے ہی گر پڑتے ہیں۔"

"تم نے یہ کس سے سُنا؟" بزرگ نے پوچھا۔

"افواہ ہے!"

"کس سے سُنی؟" بزرگ سچ مچ خفا ہو گئے۔ انہیں غصّہ بہت جلد آتا تھا۔

"صاحب مجھے خود اچھی طرح علم نہیں ہے۔ لیکن میرے ایک دوست کہہ رہے تھے کہ ان کا نوکر جب بازار گیا تو اس نے ایک دکاندار کو کہتے سنا کہ ایک خریدار نے کہیں سے یہ سنا کہ کچھ آدمی ایک جگہ چرس وغیرہ پی کر یہ کہہ رہے تھے۔۔۔"

اور وہ بزرگ پھوٹ پھوٹ کر ہنسنے لگے۔ بولے "برخوردار تم میرے غصّے کا خیال نہ کیا کرو۔ میرا غصّہ ہی کیا ہے، ابھی پارہ اُوپر پہنچا نہیں کہ فوراً نیچے اُتر آتا ہے۔"

"اور ابھی اچھی طرح نیچے اُترا نہیں کہ پھر اوپر چلا جاتا ہے۔" شیطان بولے اور وہ بزرگ پھر خفا ہو گئے۔

میں نے آہستہ سے شیطان کو ٹوکا۔ "روفی، اس طرح تو تم ساری عمر لڑکی کو نہیں جیت سکتے۔"

"تمہارا تجربہ محدود ہے۔ لٰہذا خیالات بھی محدود ہیں۔" وہ بولے۔

ہم لوگ پیدل روانہ ہوئے۔ ہمارے ساتھ وہ صاحب بھی تھے جو مکان کے سلسلے میں آئے تھے۔

راستے میں ایک جگہ موٹروں کے لیے یہ نوٹس لگا ہوا تھا۔

"خبر دار! رفتار پندرہ میل فی گھنٹہ۔"

شیطان نے سب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور بولے۔ "ذرا تیزی سے چلئے۔۔۔ پندرہ میل فی گھنٹہ۔"

مکان دیکھا۔ یونہی سا تھا۔ شیطان سے رائے پوچھی گئی۔ بولے۔ بس مکان ہے۔ مکان والے صاحب بار بار دریا کا ذکر کرتے تھے کہ دریا کے کنارے ہے۔ یہ دیکھئے دریا رہا۔ دریا بالکل سامنے ہے۔

شیطان بولے۔ ”صاحب یہ کیا آپ گھڑی گھڑی دریا کا حوالہ دیتے ہیں۔ مکان سے اس کا کیا تعلق؟ آپ اپنے دریا کو یہاں سے ہٹا لیں تو کیا فرق پڑ جائے گا؟“

جب ہم واپس آ رہے تھے تو مکان والے صاحب بزرگ اور میں تینوں شیطان سے بیزار تھے۔

میں اور شیطان علی الصبح گیارہ بجے شیو کر رہے تھے کہ ایک صاحب تشریف لائے اور شیطان سے پوچھا۔ ”کیا روفی صاحب آپ ہی ہیں؟“

”ہو سکتا ہے کہ میں روفی ہوں، ممکن ہے کہ روفی نہیں ہوں۔ اس کا انحصار اس کام پر ہے جس کے لیے آپ تشریف لائے ہیں۔“

اور یہ حقیقت تھی کہ پڑوسی صاحب ہر روز اپنا ملازم ہماری سائیکل مانگنے کے لیے بھیج دیتے تھے۔ معلوم ہوا کہ مقصود گھوڑے نے ہمیں بلایا ہے۔ مقصود گھوڑا ایم ایس سی میں پڑھتا تھا۔ وہ محبوبۂ شیطان کے پڑوس میں رہتا تھا، شاید کوچۂ یار کی کوئی نئی تازی خبر سُنانا چاہتا ہو۔ ہم جلدی جلدی شیو کرنے لگے۔

"لیکن اس وقت وہ شاید لطیف صاحب کے ہاں ہوں گے۔ ایک گھنٹے تک واپس لوٹیں گے۔" قاصد بولا۔

لطیف بھی سائنس پڑھتا تھا۔ قاصد کو ہم نے رخصت کیا اور خود تیار ہو گئے۔

"اس کا بیگ ضرور لے چلنا۔ مہینوں سے ہمارے ہاں پڑا ہے۔" میں نے یاد دلایا۔ بیگ لے کر روانہ ہو گئے۔

لطیف کے گھر پہنچے۔ دروازہ کھولا ہی تھا کہ ایک صاحب نے جلدی سے شیطان کے ہاتھ سے بیگ لے لیا اور ان کو ایک کمرے میں لے گئے جہاں ایک بچّہ بستر میں لیٹا تھا۔ شیطان کو ڈاکٹر صاحب کہہ کر مخاطب کیا گیا۔ غالباً وہ لوگ کسی ڈاکٹر کے منتظر تھے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی، شیطان نے باقاعدہ بچّے کا معائنہ شروع کر دیا۔ آنکھوں میں انگلیاں ڈالیں، ہاہا کرایا، سینہ ٹھونک بجا کر دیکھا، کمر میں ایک مکّہ رسید کر کے پوچھا۔ "درد ہوا؟"

کوئی آدھ گھنٹے تک شیطان معائنہ کرتے رہے۔ اس کے بعد بولے۔ "جناب میں ڈاکٹر نہیں ہوں، ایم اے کا طالبِ علم ہوں اور لطیف صاحب سے ملنے آیا ہوں۔ لیکن میرے خیال میں یہ کیس 'اکیوٹ ٹانسلائیٹس' کا ہے۔ ساتھ ہی

'فرنچائیٹس اور رہائیٹس' بھی ہیں۔ تعجّب نہیں کہ 'ٹریکی آئیٹس' بھی ہو۔ بہر حال گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

معلوم ہوا کہ لطیف رات سے غائب ہے۔ سیدھے مقصود گھوڑے کے گھر پہنچے۔ وہاں تالہ لگا ہوا تھا۔ سڑک پر انتظار کرنا پڑا۔

اُوپر سے کسی نے آواز دی۔ دیکھا تو مقصود گھوڑا ہنہنا رہا تھا۔

"ابے نالائق! باہر تالا لگا کر اندر بیٹھا ہے۔"

اس نے چابی پھینکی۔ تالا کھول کر ہم اندر گئے۔ معلوم ہوا کہ اس کا امتحان قریب ہے۔ اس لیے پڑھائی میں مشغول ہے۔ تبھی باہر قفل لگا کر اندر بیٹھا ہے۔

"تو ہمیں بلایا کیوں تھا؟" شیطان نے کڑک کر پوچھا۔

"بھئی صبح صبح محبوبۂ شیطان کے درشن ہوئے۔ میں چھت پر بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ اِدھر شاید ان کا بھی امتحان ہے۔ وہ کتابیں لے کر چھت پر آئیں، کچھ دیر پڑھ کر واپس چلی گئیں۔ امید، کامل ہے کہ دوبارہ اوپر آئیں گی۔"

"آئے گی کہو، ادب ودب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" شیطان بولے۔ "اور مجھے ذرا ٹھنڈا پانی پلاؤ۔ میں رعبِ حُسن سے تھرّا رہا ہوں۔"

مقصود گھوڑا پانی لینے چلا گیا اور نہ جانے کہاں کھو یا گیا۔ جب کافی دیر ہو چکی تو شیطان زور سے بولے۔ ”کہیں آکسیجن اور ہائیڈروجن لے کر مصفّا پانی تو نہیں تیار کر رہے ہو؟ سادہ پانی ہی لے آؤ۔“

مقصود گھوڑا بگٹٹ بھاگا آیا اور بولا۔ ”چلو چھت پر۔“

ہم چھت پر پہنچے اور باقاعدہ مورچہ بنا کر آڑ سے دیکھنے لگے۔ دوسری چھت پر کئی لڑکیاں بیٹھی تھیں۔

”یہ تو کئی ہیں۔“ شیطان بولے۔

”تو کیا ہوا؟ ان میں محبوبۂ شیطان بھی تو ہے، پہچان لو۔“

”کونسی ہے بھئی روفی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ہے سبز دوپٹے والی۔“ شیطان بولے۔

”وہی جس نے سفید جوتے پہن رکھے ہیں؟“ گھوڑے نے پوچھا۔

”ہم لڑکیوں کے جوتوں کی طرف توجّہ نہیں دیا کرتے۔ فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔“ شیطان نے کہا۔

اتنے میں شیطان جلدی سے بولے۔ ”ارے! سبز دوپٹے والی نہیں، وہ پیازی ساڑھی والی“

”اچھا؟“ ہم دونوں نے بغور دیکھنا شروع کیا۔

”روفی، یہ تو کچھ نہیں۔ یہ تو یونہی سی ہے۔“ گھوڑا بولا۔

”تو پھر وہ ہوگی جس کی دو لٹیں ہیں۔ جو مُسکرا رہی ہے۔“ شیطان بولے۔

”ہوگی سے کیا مطلب تمہارا؟ لعنت ہے ایسے عاشق پر جو اپنے محبوب کو نہ پہچان سکے۔“ گھوڑے نے کہا۔

”عینک کے شیشے صاف کرو۔“ میں نے مشورہ دیا۔

شیشے صاف کئے گئے۔ ”بھئی وہی ہے سبز دوپٹے والی۔“ شیطان نے آخری فیصلہ صادر کر دیا۔

اتنے میں ملازمہ آئی اور لڑکیوں کو بُلا کر لے گئی۔

طے یہ ہوا کہ لڑکی خاصی ہے لیکن ایسی نہیں کہ شیطان اس قدر شور وغُل مچائیں کہ دوستوں کے پروگرام خراب کر دیں۔

''تم دونوں بیحد بد مذاق معلوم ہوتے ہو۔ میں تمہارے معیار پر افسوس ظاہر کرتا ہوں۔'' شیطان بولے۔

''خیر بڈّی کو دکھائیں گے وہ فیصلہ کرے گا۔''

گھوڑے نے وعدہ کیا کہ جب کبھی ایسانادر موقع پھر آیا وہ ہمیں فوراً مطلع کرے گا۔ تب ہم بڈّی کو ساتھ لائیں گے۔

چلتے وقت گھوڑے نے کہا۔ ''روفی میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ تم سبز دوپٹے والی کی بجائے سفید دوپٹے والی پر عاشق ہو جاؤتو بہتر ہو گا۔ آگے تمہاری مرضی۔''

''میں عاشق ہوں یا مداری؟'' شیطان ناراض ہو کر بولے۔

اس کے بعد کچھ روز بالکل خاموشی سے گزرے۔ کیونکہ شیطان کا سہ ماہی امتحان تھااور غالباً یہ انکی زندگی کا پہلا امتحان تھا جس کے لیے انہوں نے کچھ تیاری کی تھی۔

شیطان سہ ماہی امتحان میں پاس ہو گئے۔ یہ خبر بجلی کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ غضب ہو گیا، سِتم ہو گیا۔ لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ خطوط آئے، مبارکباد کے تار آئے۔ سب دوستوں نے فیصلہ کیا کہ چونکہ مدّت کے بعد یہ مبارک ساعت نصیب ہوئی ہے، اس لیے اسی خوشی میں ایک جشن منعقد ہو۔ روپوں کا سوال اٹھا۔ شیطان کے بھائی جان وہیں رہتے تھے۔ شیطان بولے۔ "بھائی جان سے ادھار لیے جائیں۔"

"اور جو بھائی جان نہ دیں تو؟"

"ان سے پوچھیں ہی کیوں، انہیں پتہ چلے بغیر چُپ چاپ ادھار لے لیں۔"

چنانچہ جشن منعقد ہوا۔ تقریباً سب دوست مدعو تھے۔

شیطان بڑے اصرار کے بعد ان بزرگ کو بھی لے آئے۔ میں نے بہت کہا کہ اس چنڈال چوکڑی میں انہیں ہر گز نہ بلایا جائے۔ لیکن وہ نہ مانے۔ بد قسمتی سے وہ بزرگ اپنے ہمراہ دو اور بزرگ لے آئے۔ ان میں سے ایک تو کافی بوڑھے تھے اور دوسرے اتنے بوڑھے نہیں تھے۔ ان دونوں کے سامنے شیطان والے بزرگ اپنی عمر سے کہیں کم بوڑھے نظر آ رہے تھے۔

شیطان ایک چوڑے گلاس میں شربت لائے۔ بزرگ نے انکار کر دیا۔ شیطان فوراً اندر گئے اور اسی شربت کو ایک لمبوترے سے گلاس میں انڈیل کر دوبارہ لے آئے۔ بزرگ نے شکریے کے ساتھ گلاس لے لیا اور غٹ غٹ پی گئے۔

پروگرام شروع ہوا۔ دو حضرات شطرنج لے کر بیٹھ گئے اور چال سوچنے لگے۔ دیر تک انہوں نے نہ مہروں سے اپنی نظریں ہٹائیں اور نہ کوئی چال چلی۔ بس سر کھجاتے رہے۔ ان کے سامنے ڈھول بجائے گئے، طبلے کھڑکائے گئے، شور مچایا گیا، ان کا نام لے کر پکارا گیا، لیکن کیا مجال جو ان کی توجّہ شطرنج سے ذرا ہٹی ہو۔ آخر انہیں کھینچ کھینچ کر ایک طرف کیا گیا اور خوب تالیاں بجیں۔

اب گپّوں کا مقابلہ شروع ہوا۔ قواعد و ضوابط کی رو سے ہر گپ اس فقرے سے شروع ہوتی تھی۔ ”حضرات! حقیقت افسانے سے کہیں دلکش ہوتی ہے۔“ اور اس فقرے پر ختم ہوتی تھی۔ ”یقین جانیے! یہ میرا چشم دید واقعہ ہے۔“

ایک سے ایک بڑھ کر گپ ہانکی گئی۔ ججوں نے فیصلہ کیا اور بہترین گپیں یہ قرار دی گئیں:

رستم علی ریچھ۔۔۔ ”ایک روز میں سمندر کے کنارے وہیل مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص سمندر میں کودنے کی تیاری کر رہا ہے۔ غالباً خودکُشی

کے سلسلے میں۔ اتنے میں ایک راہ گیر نے اسے دوڑ کر پکڑ لیا اور وجہ پوچھنے لگا۔ وہ شخص راہ گیر کو ایک طرف لے گیا۔ دونوں کچھ دیر گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد دونوں کنارے پر گئے اور اکٹھے سمندر میں کود گئے۔"

بڈّی۔۔۔ "برازیل کے کچھ حصّوں میں اس قدر گرمی پڑتی ہے کہ وہاں کے باشندے کہیں اور جا کر رہتے ہیں۔"

تربوز لال تربوز۔۔۔ "صحرائے اعظم کے کچھ حصّوں میں اس قدر خاموشی ہے کہ وہاں آپ اپنے آپ کو سوچتے ہوئے سُن سکتے ہیں۔"

مقصود گھوڑا۔۔ "چین کے ایک مشہور حصّے میں اس قدر ملیریا ہے کہ وہاں مچھروں کو بھی ملیریا ہو جاتا ہے اور بیشتر مچھر ہلاک ہو جاتے ہیں۔"

شیطان۔۔۔ "آج کل میں خوب بندوق چلاتا ہوں۔ میرے نشانے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کل میں نے ایک گولی چلائی اور دوسری گولی سے پہلی کے ٹکڑے اڑا دیئے۔"

لومڑی چند جڑاؤ۔۔۔ "ہمارے ہاں ایک بہت پرانا کلاک ہے۔ اس کے پنڈولم کا سایہ دیوار پر دس سال سے پڑ رہا ہے اور دیوار پر سائے کا نشان پڑ گیا ہے۔"

حکیم عمر عیّار۔۔۔۔ ”جب میں گھوڑے پر سوار ہو کر کوہ ہمالیہ کی سیر کر رہا تھا تو شام کو میں نے برف پر ایک درخت کے نیچے اپنا بستر لگایا اور گھوڑے کو درخت سے باندھ کر سو گیا۔ علی الصبح کیا دیکھتا ہوں کہ برف پگھل چکی ہے۔ میں درخت کی چوٹی پر بیٹھا ہوں اور گھوڑا ٹہنیوں سے لٹک رہا ہے۔“

کھانا شروع ہوا۔

”سالن میں ہلدی ذرا کم ہے۔“ ایک بزرگ بولے۔ کئی حضرات نے ان کی تائید بھی کی۔ کھانا ختم ہو چکنے کے بعد چھوٹی چھوٹی پُڑیاں تقسیم ہوئیں۔ پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“ شیطان بولے۔ ”ان میں ہلدی ہے۔ جن حضرات نے ہلدی کی کمی کو بری طرح محسوس کیا ہے وہ اب پھانک لیں۔“

اب گانے کی باری آئی۔ بڈّی نے پکڑ لیا کہ گاؤ۔ وہ معذرت کرنے لگا لیکن کوئی نہ مانا اور بڈّی کو گانا پڑا۔

بڈّی کے بعد شیطان کی باری آئی۔ وہ بولے۔ ”میں خود تو بالکل نہیں گا سکتا البتہ کسی مشہور گویّے کی نقل اتار سکتا ہوں۔ مثلاً اب میں اُستاد عبدالکریم خان کی نقل اتاروں گا۔“ یہ کہہ کر شیطان نے گانا شروع کیا اور خوب گایا۔ کسی کو گمان

تک نہ تھا کہ شیطان اتنا اچھا گا سکتے ہیں۔ خوب تعریف ہوئی۔ شیطان بولے۔ ”حضرات یہ تو نقل تھی۔ میں خود تو بالکل نہیں گا سکتا۔“

بزرگ بولے۔ ”بہت اچھا مالکوس تھا۔ تمہیں کون کون سے راگ آتے ہیں؟“

شیطان مؤدبانہ بولے۔ ”فقط دو راگ آتے ہیں۔ ایک تو وہ جو مالکوس ہے اور دوسرا وہ جو مالکوس نہیں ہوتا۔“

جشن کا اختتام قریب تھا اس لیے سب اپنی اپنی چیزیں اکٹھی کرنے لگے۔ ان بزرگ کے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور وہ کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ شیطان نے پوچھا۔ وہ بولے ”دیا سلائی ڈھونڈ رہا ہوں۔“

”کیا آپ اپنی ٹارچ روشن کرنا چاہتے ہیں، یہ لیجئے۔“ یہ کہہ کر شیطان نے ماچس ان کے ہاتھ میں دے دی۔

اس کے بعد سب کھڑے ہو گئے اور شیطان نے دعا مانگی (اس قسم کا ہر جشن اسی دُعا پر ختم ہوتا تھا) شیطان سر جھکا کر بولے۔ ”خدایا! ہمیں اُلّو کی کی دانائی عطا فرما اور اُونٹ کا سا صبر۔ ہمیں ایسی چشمِ بینا عطا فرما جس کے لیے عینک کی ضرورت نہ پڑے۔ ہمارے خیالات کی رفتار اتنی تیز ہو کہ صبا کو پیچھے چھوڑ جائے۔ ہم میں کم

از کم دس ہارس پاور جتنی قوّت ہو۔ ہماری روح اور دل میں ٹیلیفون کا سلسلہ قائم ہو جائے اور تو خود ہمیں بذریعہ وائرلیس نیک ہدایت دے۔ آمین!"

سب نے زور سے کہا۔ "آمین!" (سوائے بزرگوں کے) اور جشن ختم ہوا۔

اور میں نے شیطان سے صاف صاف کہہ دیا کہ ان بزرگ کے سامنے ایسی ایسی حرکتیں کرنے کے بعد کُنبے میں تم ہر دلعزیز تو کیا دلعزیز بلکہ محض عزیز تک نہیں ہو سکتے۔

سنیچر کو ٹیم کا انتخاب ہونے لگا۔ اتوار کو ہمارا سالانہ اور اہم ترین کرکٹ میچ تھا۔ اس مرتبہ ہم باہر جا رہے تھے۔ رات بھر کا سفر تھا۔ سنیچر کی رات کو چل کر اتوار کی صبح وہاں پہنچنا تھا۔ شیطان نے اصرار کیا کہ ان کو ضرور کھلایا جائے۔ کپتان ہچکچایا کیونکہ شیطان کھلاڑی ایسے ویسے ہی ہیں۔ ان کا زیادہ سے زیادہ سکور صفر تھا۔ ان کے محبوب سٹروک دو تھے۔ آف بائی اور لیگ بائی۔ اپنی زندگی میں انہوں نے کیچ بھی کئے تھے۔ پہلا اس طرح کہ ایک میچ میں شیطان اور میں سلپ میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان کی جدید ترین محبوبہ کا قدیم ترین محبوبہ سے موازنہ کیا۔ وہ ہنس کر بولے۔ ملاؤ ہاتھ۔ انہوں نے میری طرف ہاتھ بڑھایا اور شپ سے گیند ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ کھلاڑی آؤٹ ہو گیا۔ یہ بات اور تھی کہ نہایت ہی اچھا کھلاڑی آؤٹ ہوا تھا اور نہایت ہی لاجواب کیچ

شیطان نے کیا تھا۔ دوسرا یوں کہ مخالف کھلاڑی نے زور سے ہٹ لگائی اور گیند درخت میں الجھ گئی۔ شیطان لپک کر درخت پر چڑھ گئے۔ گیند پکڑ لائے اور امپائر سے اپیل کی کہ گیند زمین سے اونچی تھی کہ کیچ کر لی گئی ہے۔ بڑا جھگڑا ہوا جب نوبت ستیہ گرہ تک پہنچی تو سب نے مان لیا کہ واقعی شیطان نے کیچ کیا ہے۔ ویسے یہ درخت راؤنڈری لائن کے اندر تھا۔

میں نے بہت کوشش کی کہ انہیں بارہواں ہی رکھ لیں۔ آخر شیطان بطور سکورر (Scorer) پارٹی میں شامل کئے گئے۔ وہ اپنی اس بے قدری پر خفا ضرور تھے۔

شام کو ہم اسٹیشن پر پہنچے. گاڑی رات کے بارہ بجے آنی تھی اور صبح سات بجے منزلِ مقصود پر جا پہنچی تھی۔ شیطان نے آکر خبر دی کہ ایک انٹر کا ڈبہ یہاں سے اسی ٹرین میں لگایا جاتا ہے۔ وہ ڈبہ اس وقت اسٹیشن کے ایک تاریک گوشے میں کھڑا ہے۔ بہتر ہو گا کہ ہم سب ابھی سے اس پر قبضہ کر لیں اور بستر بچھا کر سو جائیں۔ تجویز معقول تھی۔ ہم سب شیطان کے ساتھ ہو لیے۔ کپتان نے معائنہ کیا۔ اِدھر اُدھر سے سونگھا۔ جب اچھی طرح تسلّی ہو گئی تو ہمیں اجازت دے دی۔ ہم نے بستر بچھا لیے۔ ہلکی ہلکی سردی تھی اس لیے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں۔ روشنی بجھا کر لیٹ گئے۔ شیطان کا اصرار تھا کہ فوراً سو جائیں، کل میچ

ہے۔ لیکن نو دس بجے کسی کو نیند آتی ہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ آخر شیطان نے زبردستی پکڑ کر سب کو سلایا۔

رات کو میری آنکھ کھلی بالکل اندھیرا تھا۔ اِدھر اُدھر جھانکا اور آہستہ سے بولا۔ "روفی!"

آواز آئی۔ "ہاں!"

"کیا بجا ہو گا؟"

"پتہ نہیں۔ بس تم اس وقت سو جاؤ۔"

"گاڑی کسی اسٹیشن پر کھڑی ہے شاید؟"

"شاید!" شیطان نے کہا۔

میں نے بہت کوشش کی۔ لیکن نیند نہ آئی۔ اتنے میں دو چار حضرات اُٹھ کھڑے ہوئے اور وقت پوچھنے لگے۔

"میں کوئی گھڑیال ہوں یا چوکیدار؟" شیطان خفا ہو کر بولے۔ "اگر اسی طرح رات بھر جاگتے رہے تو کھیلو گے خاک؟"

"لیکن روفی یہ گاڑی چلتی کیوں نہیں؟ دیر سے کھڑی ہے۔"

”کسی بڑے اسٹیشن پر کھڑی ہو گی یا کہیں کراس ہو گا۔“ شیطان بولے۔

ایک صاحب نے کھڑکی کھولنا چاہی۔ شیطان نے فوراً ڈانٹ بتائی۔ ”خبردار جو کسی نے کھڑکی کھولی۔ مجھے ٹھنڈی ہوا لگتے ہی کھٹ سے نمونیہ ہو جاتا ہے۔ آخر تم لوگ سو کیوں نہیں جاتے۔“

سب خاموش ہو گئے۔ میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن تھوڑی دیر میں پھر جاگ اٹھا۔ ڈبّے میں بحث ہو رہی تھی۔ سب کہہ رہے تھے کہ گاڑی کھڑی ہے، لیکن شیطان یقین دلا رہے تھے کہ چل رہی ہے۔ انہوں نے سائنس کے چند اصول بتا کر ثابت کر دیا کہ جب گاڑی تیزی سے متحرک ہو تو سواریوں کو حرکت محسوس نہیں ہوتی اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کھڑی ہے۔

اتنے میں ایک گاڑی مخالف سمت میں تیزی سے گزر گئی۔ شیطان فاتحانہ انداز میں بولے۔ ”یہ دیکھا ہماری گاڑی ایک اسٹیشن سے گزری ہے۔“

غالباً سب مطمئن ہو گئے اور تھوڑی دیر میں سو گئے۔

جب میری آنکھ کھلی تو مجھے ککڑوں کُوں سنائی دی۔ چند مُرغے بڑی مستعدی سے اذانیں دے رہے تھے۔

”روفی!“ میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہشت!" شیطان بولے۔ "سو جاؤ۔"

"یہ مرغے کہاں بول رہے ہیں؟"

چند حضرات اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سب یہی پوچھنے لگے کہ یہ مرغے کہاں بول رہے ہیں۔

شیطان نے جھلّا کر کہا۔ "یہ تم لوگوں کو ہو کیا گیا ہے؟ مجھے سونے کیوں نہیں دیتے؟ جہنم میں جائیں مُرغے اور جنت کو سدھارو تم سب۔ اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے کہ ساتھ کے ڈبے میں کسی مسافر کے مُرغے ہیں جو بول رہے ہیں۔ کیا مُرغے ساتھ لے کر سفر کرنا جرم ہے؟'

پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ لیکن بہت جلد ایک گوشے میں کھُسر پھُسر شروع ہو گئی اور ایک صاحب نے دروازہ کھول دیا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ صبح کا سُہانا سماں ہے۔ طیّور چہچہا رہے ہیں۔ نسیمِ صبح اٹکھیلیاں کرتی پھر رہی ہے۔ مرغ اذانیں دے رہے ہیں۔ اور ڈبّہ وہیں کھڑا ہے جہاں رات تھا۔ ایک قُلی جا رہا تھا۔ اس سے اسٹیشن کا نام پوچھا گیا۔ معلوم ہوا کہ ہم واقعی اُسی اسٹیشن پر ہیں جہاں سے کل رات روانہ ہوئے تھے۔

ہم سہ پہر کو چاء پی رہے تھے کہ بڈّی آ گیا۔ شیطان بولے۔ "بڈّی آج کیا پکا ہے؟"

بڈّی نے چند کھانوں کے نام گِنوا دیئے۔ شیطان نے تازہ خبر پوچھی۔ بڈّی نے تازہ خبریں سُنا دیں۔ شیطان نے شہر کی بہترین پکچر کا نام پوچھا۔

بڈّی بولا "'مفلس عاشق' عرف 'مفلس معشوق'۔"

"اور میں کچھ موٹا تو نہیں ہو گیا؟" شیطان نے مُسکرا کر پوچھا۔

"موٹا؟ موٹے کیا تم باقاعدہ پہلے بھی نہیں ہو؟" بڈّی بولا۔

بڈّی کو اپنا گھر یاد آ رہا تھا۔ وہ اپنے گھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہاں کے خوشنما نظارے، خوشگوار موسم، عزیز و اقارب۔

شیطان بولے۔ "تم اپنے گھر کا ذکر کچھ ایسے انداز سے کرتے ہو کہ بعض دفعہ تو مجھے تمہارا گھر یاد آنے لگتا ہے۔"

ہم تاش کھیلنے لگے۔ شیطان کی فرمائش پر فیصلہ ہوا کہ آج شرط لگے گی۔

"کل میں نے ایک نہایت ہی دلکش خواب دیکھا۔" میں نے کہا۔ "نہایت ہی حسین خواب، بس سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ آہاہاہا!" لیکن شیطان خاموش تھے۔

"سناؤں؟" میں نے پوچھا۔

"ہر گز نہیں۔" شیطان بولے۔

"ایسا خواب ہے کہ۔۔۔۔"

"بالکل نہیں، قطعاً نہیں!!" شیطان نے کہا۔

"سخت خود غرض ہو روفی۔ بڑا افسوس ہے تم نے اتنے اچھے خواب کی ہتک کر دی۔"

"بھئی اس وقت کسی قسم کا خواب سننے کو جی نہیں چاہتا۔ آج میں کچھ بیزار سا ہوں۔"

معلوم ہوا کہ شیطان نے آج محبوبۂ شیطان کو دیکھا تھا۔ ان کے گھر گئے تھے۔

"آخر ہوا کیا؟" بڈّی نے پوچھا۔

"یہ پوچھو کہ کیا نہیں ہوا؟ آج میں نے ایسا نظارہ دیکھا کہ واللہ خودکُشی کرنے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن تم لوگوں کی وجہ سے زندہ رہنا پڑا۔ آج میں نے دیکھا کہ ایک روپے پیسے والے صاحب اس لڑکی کو دیکھنے آئے۔ پہلے تو ان دونوں کا تعارف

کرایا گیا۔ پھر لڑکی کی باقاعدہ نمائش شروع ہوئی۔ چاء پر بلائی گئی۔ اس کی دستکاری کے نمونے دکھائے گئے اور آخر میں لڑکی نے گانا گایا۔"

"کون ساراگ تھا؟" میں نے بڑے شوق سے پوچھا۔

"مالکوس نہیں تھا لیکن اس ساری نمائش میں مجھے اس کا گانا بہت برا لگا۔ اب میں اس لڑکی سے بالکل بیزار ہوں۔ واقعی مقصود گھوڑا سچ کہتا تھا کہ وہ اتنی حسین بھی نہیں ہے۔ اس سے تو وہ سفید دوپٹے والی ہی بہتر تھی۔ اب مجھے محبّت سے سخت نفرت ہو گئی ہے اور نفرت سے محبّت ہوتی جا رہی ہے۔"

"واقعی؟" ہم دونوں نے پوچھا۔

"بالکل یقیناً!"

"تمہارا عشق بھی تُرپ چال کی طرح ہے۔" بڈّی بولا۔ "یک لخت شروع ہو جاتا ہے اور بالکل ذرا سی دیر رہتا ہے۔"

"اور رنگ بدلتا رہتا ہے۔" میں نے لقمہ دیا۔

"تُرپ چال!" شیطان نے پتہ پٹخا۔

میں اور بڈّی ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے۔

"پتّے ڈالتے جاؤ۔" شیطان بولے۔ "میں جانتا ہوں کہ اس وقت پانچ بجے ہیں۔ بڈّی مجھے معلوم ہے کہ سڑک پر ایک نہایت ہی حسین و جمیل گائے جارہی ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ صوفے کے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ یہ تم بدرنگ کیوں ڈالتے ہو۔۔۔۔ کہہ جو دیا ترپ چال۔۔۔۔!"

تحت الشُعور اور لا شُعور

تحت الشُعور اور لا شُعور .... از حضرت فرید شعوری ....
چھاپنے والے بے شُعور برادرز.............. قیمت درج نہیں ہے۔
تحت الشُعور پر زور ڈالنا پڑتا ہے۔

یہ ایک ماہرِ نفسیات کی معرکتہ آلاراء کتاب ہے۔ ملک کی خوش نصیبی ہے کہ اب فرید شعوری جیسے حضرات نے بھی کتابیں لکھنی شروع کر دی ہیں۔ فرید صاحب ابھی ابھی یورپ سے تشریف لائے ہیں۔ یورپ میں انہوں نے کئی سال ڈاکٹر سگنل فراڈ(Dr. Signal Fraud) کے ساتھ کام کیا ہے۔ فرید صاحب کے نام میں بھی ایک زبردست راز مضمر ہے۔ پہلے انکا نام کچھ اور تھا لیکن فراڈ صاحب کے ساتھ رہتے ہوئے فرید ہو گیا۔

ہم نے اس کتاب پر تقریباً ڈیڑھ ماہ صرف کیا لیکن ہم کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔ اتفاقاً ہماری نظر دیباچے پر پڑ گئی۔ قابل مصنّف نے کتاب کی ترکیب استعمال دیباچے میں دے دی ہے۔ کتاب سمجھنے کے لیے اپنے تحت الشُعور کو جگانا پڑتا ہے۔ اور

اپنے تحت الشُعور کو جگانا ایک طویل عمل ہے۔ مصنّف نے صاف صاف لکھا ہے کہ ہر شخص کو قدرت نے ایک تحت الشُعور اور ایک عدد لا شُعور عطا کیا ہے۔ کئی بد قسمت انہیں کھو بیٹھتے ہیں۔ ایسوں کو کہیں سے تحت الشُعور ادھار مانگنا پڑے گا ورنہ وہ کتاب ہر گز نہ سمجھ سکیں گے۔ خیر ہم نے کوشش کی اور اس کتاب کو سمجھنے میں ایک حد تک کامیاب ہو گئے۔

کتاب کا نصف حصّہ تو بے حد دلچسپ ہے۔ اس حصّے میں مصنّف نے اپنے اور ڈاکٹر فراڈ کے حالات لکھے ہیں۔ چند ایک واقعات تو نہایت ہی پُر لطف ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ مصنّف اور ڈاکٹر فراڈ صاحب دونوں آوارہ گردی کے سلسلے میں گرفتار کر لیے گئے۔ جب انہوں نے بیان دیتے وقت کہا کہ یہ دونوں اپنے تحت الشُعور کو تازہ ہوا دینے نکلے تھے تو عدالت پر گھڑوں اور بالٹیوں پانی پڑ گیا۔

پھر ایک مرتبہ ان دونوں کو دھوکے اور غبن کے شُبے میں دھر لیا گیا۔ جب ان کی تلاشی ہو رہی تھی تو یہ مُسکرا کر بولے کہ قصور تو ہمارے لا شُعور کا ہے۔ ہمارا نہیں۔ اور پولیس مُنہ دیکھتی رہ گئی۔

مصنّف کی زندگی کے اکثر ناقابلِ فراموش لمحے اور پیاری گھڑیاں ڈاکٹر فراڈ کے ساتھ جیل میں گزری ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصّے میں مصنّف نے تحت الشُعور کے معنٰی اس کی اہمیت اور فوائد بتائے ہیں۔ کتاب لکھنے کا خیال مصنّف کو یورپ میں آیا۔ کیونکہ وہاں تحت الشُعور کا رواج عام ہے۔ ایک مرتبہ مصنّف اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک معمّر شخص اپنے لڑکے کو لایا اور بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب! ذرا اس بچّے کو تو ملاحظہ فرمایئے۔ پچھلے سال یہ بھلا چنگا تھا۔ اب نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ روز بروز اس کا تحت الشُعور خراب ہوتا جارہا ہے۔“

یہ سُن کر مصنّف کو ہندوستان کی حالت پر رونا آگیا اور وہ سچ مچ رو دیا۔ اس روز اس نے تہیّہ کر لیا کہ وہ اس اہم مضمون پر ضرور کتاب لکھے گا۔ چنانچہ اس نے فوراً ایک کتاب لکھ دی۔

مصنّف نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے دن پھر رہے ہیں۔ اور یہاں بھی آہستہ آہستہ تحت الشُعور کا رواج ہوتا جارہا ہے۔ آپ نے لاریوں پر لکھی ہوئی عبارت تو ضرور پڑی ہو گی۔ جلی الفاظ میں درج ہوتا ہے۔

”آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔“

”لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے۔“

”پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔“

"خدا حافظ۔!" وغیرہ وغیرہ

دراصل یہ ایک نہایت ہی لطیف اشارہ ہے تاکہ مسافروں کے تحت الشُعور میں یہ بات پہلے ہی بٹھا دی جائے کہ ڈرائیور کا ارادہ خطرناک ہے اور کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ اسی طرح جب لوگ کسی مہمان کو رخصت کرتے وقت کہتے ہیں کہ "بہ سلامت روی دباز آئی" تو ان کے دل میں دراصل یہ ہوتا ہے کہ "تو سلامت رہے میں باز آیا۔"

سرجے سی بوس نے ثابت کیا تھا کہ نباتات میں بھی جان ہے اور پورے بھی ہماری طرح جیتے جاگتے ہیں۔ لیکن فرید صاحب نے جہاں انسانوں اور حیوانوں کے تحت الشُعور پر تجربے کئے ہیں وہاں بے جان چیزوں کے تحت الشعور پر بھی دھاوا بول دیا ہے۔ اس میدان میں وہ سر بوس سے چند قدم آگے نکل گئے ہیں۔ اسی سلسلے میں انہوں نے ایک ذاتی مشاہدہ قلم بند کیا ہے۔

ایک مرتبہ وہ فورٹ عباس سے واپس آنا چاہتے تھے۔ وہاں ایک ٹرین شام کو پہنچتی تھی۔ رات بھر کھڑی رہتی اور علی الصبح واپس روانہ ہوتی۔ اس رات گاڑی بہت دیر سے آئی۔ کوئی ایک بجے کے قریب انجن کو فرصت ہوئی اور اسے ایک

طرف کھڑا کر دیا گیا۔ مُنہ اندھیرے ڈرائیور نے انجن کو تیار کیا اور پلیٹ فارم پر لے آیا جہاں گاڑی کھڑی تھی۔ پورے پانچ بجے گاڑی چل پڑی۔ اگلے اسٹیشن پر رُکی تو چند مسافر ڈرائیور کے پاس آئے اور گڑ گڑا کر بولے۔ "بھیّا بہاولنگر کی عدالت میں آج ہماری حاضری ہے۔ یہ ہے ہمارے ٹکٹ ہم کچھ اور بھی دے دیں گے، ہمیں انجن میں بٹھالے۔"

ڈرائیور نے مُسکرا کر فائرمین کی طرف دیکھا اور بولا۔ "انجن میں بٹھالوں؟ سبحان اللہ، یہ بھی ایک ہی رہی۔"

لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ مانتے ہی نہیں تو جھنجھلا کر بولا۔ "کیا مصیبت ہے آخر تم لوگ گاڑی میں کیوں نہیں بیٹھتے؟"

مسافروں نے چلّا کر کہا۔ "کون سی گاڑی میں؟"

"اس گاڑی میں!" ڈرائیور نے انجن کے پیچھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ بھونچکا رہ گیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ گاڑی غائب ہے۔ گاڑی پچھلے اسٹیشن پر رہ گئی تھی۔ انجن سیٹی دے کر اکیلا چلا آیا تھا۔ آخر ڈرائیور انجن لے کر واپس گیا اور گاڑی لایا۔

ذرا غور فرمایئے اس میں انجن کے تحت الشُعور کی ہلکی سی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ گاڑی دیر سے آئی۔ انجن تھکا ہوا تھا۔ علی الصبح چُپکے سے گاڑی کو چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

ہمارے خیال میں انجن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔

مصنّف نے چھٹے باب میں ایک اودبلاؤ کے لاشُعور کو نہایت چابکدستی سے بیان کیا ہے۔ ایک اور جگہ مصنّف نے اپنی آپ بیتی لکھی ہے۔ مصنّف نے ایک بندر خریدا۔ فرصت کے اوقات میں بندر اور مصنّف خوب کھیلتے کودتے۔ اس کے بعد بندر کو محلّے میں چھوڑ دیا جاتا کہ وہ پڑوسیوں سے بھی ملاقات کر سکے۔ ایک روز وہ دونوں کھیل رہے تھے کہ دفعتاً مصنّف کو ایک ضروری کام یاد آ گیا اور اس نے جلدی سے بندر کو ساتھ والے کمرے میں بند کر کے قفل لگا دیا اور خود باہر چلا گیا۔

واپسی پر اسے خیال آیا کہ دیکھیں تو سہی بندر کمرے میں کیا کر رہا ہے۔ چنانچہ آہستہ سے مصنّف جھکا اور دروازے کے روزن کے پاس اپنی آنکھ لے گیا اور روزن میں دیکھنے لگا۔ روزن میں اسے ایک آنکھ دکھائی دی جو دوسری طرف سے دیکھ رہی تھی۔ بندر کی آنکھ! بندر دوسری طرف سے جھانک رہا تھا۔ جو شکوک

مصنّف کو بندر پر تھے وہی بندر کو مصنّف پر نکلے۔ بندر کے تحت الشُعور کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا دی جا سکتی ہے۔

جانوروں اور پرندوں کے بعد مصنّف انسانوں کی طرف آتا ہے۔ انسانی شعور کو کئی طریقوں سے تقسیم کیا گیا ہے۔ سب سے آسان اور مشہور ڈاکٹر سگنل فراڈ کی تقسیم ہے۔ ہم قارئین کی دلچسپی کے لیے اس کا ذرا سا حصّہ نقل کئے دیتے ہیں۔

یہ شجرۂ نسب آگے بہت دور تک گیا ہے۔ تحت الشُعور کے بعد تحت تحت تحت الشُعور۔ اسی طرح کئی صفحوں تک یہ سلسلہ چلتا ہے۔

مصنف نے بچّوں کے شعور پر بے شمار تجربے کئے ہیں اور آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ بچّے گو دیکھنے میں کافی بیوقوف نظر آتے ہیں لیکن ان کے شعور کافی تیز ہیں۔

ایک بچّے سے امتحان میں پوچھا گیا کہ خطِ استوا کے جنگلات کے کچھ مشہور ترین جانوروں کے نام لکھو۔ بچّہ جغرافیہ میں کمزور تھا لیکن اس کا لاشُعور بلا کا ہوشیار تھا۔ چنانچہ بچّے نے جواب لکھا۔ تین چیتے اور تین شیر۔

لاشُعور نے بچّے کی لاعلمی بھی چھپالی اور میزان بھی پورا کر دیا۔

اسی طرح ایک بچّہ حساب کا ایک سوال حل کر رہا تھا۔ ہر مرتبہ جواب غلط آتا اور ایک آنے کی کمی ہو جاتی۔ ماسٹر صاحب چِڑ گئے۔ چنگھاڑ کر بولے۔ ”جب تک صحیح جواب نہیں نکالو گے چھُٹی نہیں ملے گی۔“ بچّے کو بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے دو مرتبہ اور کوشش کی لیکن جواب میں ایک آنے کی کمی بدستور رہی۔ آخر ایسے میں اس کا تحت الشُعور آڑے آگیا۔ بچّے نے جلدی سے جواب نکالا اور ایک آنہ جیب سے نکال کر سلیٹ پر رکھ دیا اور ماسٹر سے بولا۔ ”یہ لیجئے، یہ رہا وہ ایک آنہ۔ اب مجھے چھُٹی دے دیجئے۔“

ایک اور جگہ مصنّف نے ایک بچّے کے شعور کو واضح کیا ہے۔ ایک اُستاد نہایت خونخوار تھے۔ بچّوں کو بے تحاشا مارتے تھے۔ ایک روز ان کو سانپ نے کاٹ لیا اور وہ اللہ کو پیارے ہوئے۔

اس سانحے پر ایک مجلس منعقد ہوئی۔ پہلے اُستادوں نے ماتمی تقریریں کیں۔ اس کے بعد بچّوں کا نمبر آیا۔ ایک بچّے نے نہایت درد انگیز تقریر کی۔ مرحوم کی خوبیاں گنوائیں اور پھر حیرت آمیز لہجے میں بولا۔ ”نہایت ہی افسوس کی بات ہے کہ ماسٹر صاحب نے سانپ کو کاٹ کھایا ہے۔“

یہ ہم مانتے ہیں کہ اس نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ ویسے ہی مُنہ سے نکل گیا۔ لیکن یہ حقیقت ماننا پڑے گی بچّے کے تحت الشُعور میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ماسٹر صاحب کو دنیا کی کوئی چیز ایذا نہیں پہنچاسکتی اور وہ خود جسے چاہیں تباہ کر سکتے ہیں۔

بچّوں کے بعد نوجوانوں کا نمبر آتا ہے۔ مصنّف کی رائے ہے کہ نوجوانوں کا لاشُعور بچّوں کے مقابلے میں قدرے کُند ہے۔

مصنّف نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ ایک نوجوان دن بھر آوارہ گردی کرتا اور رات کو بڑی دیر سے آیا کرتا۔ وہ دوسری منزل کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ کمرے میں جب تھکا ہارا پہنچتا تو پہلے اپنے دائیں پاؤں کا جوتا اُترتا اور

دھڑام سے فرش پر دے مارتا۔ پھر بائیں پاؤں کا جوتا اسی طرح فرش پر پٹختا اور سو جاتا۔ نچلے کمرے میں ایک معمّر شخص رہتا تھا، جو رات گئے دیر تک اسی انتظار میں بیٹھا رہتا کہ اب نوجوان آتا ہے اور جوتے پٹخ کر سوتا ہے۔ وہ نوجوان کے سونے کے بعد ہی سویا کرتا۔ آخر ایک روز اس سے نہ رہا گیا۔ وہ نوجوان سے ملا اور بولا۔ "جناب بد قسمتی سے آپ کا فرش میری چھت ہے۔ میں آپ کے جوتوں کا انتظار کرتے کرتے تنگ آ جاتا ہوں۔ آپ جوتے خاموشی سے کیوں نہیں اُتارتے؟"

نوجوان نے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ وہ اس صفائی سے جوتے اُتارے گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔

اگلی بات وہ تھکا ہوا کمرے میں پہنچا۔ ایک جوتا اُتارا اور دھڑام سے فرش پر دے مارا۔ یک لخت اسے اپنا وعدہ یاد آ گیا۔ اس نے دوسرا جوتا بالکل آہستہ سے فرش پر رکھا اور سو گیا۔ صبح جب وہ نیچے اُترا تو اسے وہی معمّر شخص ملا جس کی آنکھیں سوجی ہوئی اور سُرخ تھیں۔ اس نے نوجوان کو بتایا کہ وہ رات بھر جاگتا رہا، اس انتظار میں کہ دوسرا جوتا اب دھڑام سے گِرا۔ وہ رات بھر دوسرے جوتے کا انتظار کرتا رہا۔

اس سے صاف ظاہر ہے وہ خود نہیں جاگا، کسی نامعلوم طاقت نے اسے بیدار رکھا جسے وہ خود نہیں جانتا تھا۔ یہ اس کا تحت الشُعور تھا یا لاشُعور سمجھ لیجئے۔ ہم معافی چاہتے ہیں کیونکہ ہم خود ان دونوں میں تمیز نہیں کر سکتے۔

مصنّف نے کہیں کہیں پرانی باتیں بھی شامل کر لی۔ لیکن چونکہ ان کا تعلق کتاب کے مضمون سے براہِ راست ہے اس لیے ہم مصنّف کو معاف کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہ واقعہ کافی پرانا ہے کہ ایک شخص کا خط بہت خراب تھا اور یہ بات اس کے شعور کی گہرائیوں میں پختہ ہو چکی تھی۔ کسی ملاقاتی نے اس سے سفارشی خط لکھوانا چاہا، وہ بولا "معاف فرمایئے آج کل میرے گھٹنے میں درد ہے۔"

ملاقاتی نے پوچھا۔ "حضرت خط لکھنے کا گھٹنے سے کیا تعلق ہے؟"

یہ بولے۔ "میرا خط اس قدر خراب ہے کہ جب بھی لکھ کر بھیجتا ہوں تو اسے پڑھنے کے لیے بھی مجھے ہی بلایا جاتا ہے۔ میرا لکھا کوئی اور نہیں پڑھ سکتا۔"

دیکھا آپ نے ہماری زندگی کے ذرا ذرا سے واقعات میں لاشُعور کو کتنا دخل ہے۔ مصنّف نے چند واقعات ڈاکٹر سگنل فراڈ کی سوانح عمری سے بھی نقل کئے ہیں۔ یہ سوانح عمری نہایت لاجواب چیز ہو گی۔ کاش کہ کوئی مترجم اس کا ترجمہ اُردُو میں کر دیں۔

جب ڈاکٹر موصوف تبّت اور چین کی سرحد پر تھے تو ان کی شناسائی ایک ایسے کسان سے ہو گئی جو کئی سال سے یہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کی زمین جو کہ عین سرحد پر تھی، تبّت سے علیحدہ کر کے چین میں شامل کر لی جائے۔ ایک روز اسے اطلاع ملی کہ اس کی درخواست منظور ہو گئی ہے۔ وہ سیدھا فراڈ صاحب کے پاس آیا اور بولا۔ ”خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب میں چین میں آ گیا ہوں ورنہ اس سال تبّت کی شدید سردی تو مجھ سے ہرگز برداشت نہ ہوتی۔“

آپ غور کیجئے یہ لاشُعور بھی کیسی مفید چیز ہے۔ کسان کی زمین اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلی۔ لیکن پھر اس کی تسلّی ہو گئی۔

فراڈ صاحب ایک روز ڈاکٹروں کی مجلس میں مدعو تھے۔ اتفاق سے وہاں ایک حیوانات کے ڈاکٹر بھی کہیں سے آ پہنچے۔ انسانی بیماریوں پر بحث ہو رہی تھی لیکن حیوانات کے ڈاکٹر بڑھ بڑھ کر بول رہے تھے۔ سب کو ناگوار محسوس ہوا۔ صدر صاحب یہ دخل در معقولات برداشت نہ کر سکے اور پوچھا۔ ”کیوں صاحب کیا یہ سچ ہے کہ آپ حیوانوں کے ڈاکٹر ہیں؟“

وہ نہایت انکسار سے بولے۔ ”جی ہاں یہ بالکل درست کہا ہے کہ میں حیوانوں کا ڈاکٹر ہوں۔ کیا آپ بیمار ہیں؟“

اگر ہم اپنی زندگی کا بغور مطالعہ کریں تو بے شمار اسرار آشکار ہو جائیں۔ ہماری اکثر حرکتیں لاشعوری طور پر سرزد ہوتی ہیں۔ یعنی ان پر ہمارا کوئی قابو نہیں رہتا۔

فراڈ صاحب ایک دفعہ رات کو ایک سنسان علاقے میں سفر کر رہے تھے۔ یکایک ریل کی کھڑکی سے انہوں نے چند پراسرار شبیہیں دیکھیں جو ایک الاؤ کے گرد بیٹھیں آگ تاپ رہی تھیں۔ فراڈ صاحب زیادہ بزدل نہیں ہیں پھر بھی ان کی گھگھی بندھ گئی۔ اور کوئی ہوتا تو اپنے سفر کو جاری رکھتا اور اس واقعے کو بھول جاتا لیکن فراز صاحب نے سوچا کہ اس میں ضرور کسی کے تحت الشعور کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ اگلے اسٹیشن پر اُتر گئے اور پیدل واپس چل کر موقع پر پہنچے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ چھ نہایت معزّز حضرات تولیے باندھے آگ کے گرد بیٹھے اپنے کپڑے سکھا رہے ہیں۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ پچھلی ٹرین کے مسافر تھے اور اگلے اسٹیشن پر اُترنا چاہتے تھے۔ ایک اسٹیشن پہلے ہی انہوں نے اُترنے کی تیاری شروع کر دی۔

ان کے پاس سامان زیادہ نہیں تھا۔ فقط ہلکے پھلکے بیگ تھے۔ گاڑی کی رفتار ہلکی ہوئی اور وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ گاڑی رُکی۔ ایک صاحب نے بیگ سنبھالا دروازہ کھول کر رات کی تاریکی میں آہستہ سے پلیٹ فارم پر اُتر گئے۔ ان کے بعد دوسرے نے بالکل یہی کیا۔ تیسرا چوتھا غرضیکہ چھ کے چھ نیچے اُتر گئے۔

اُدھر اتفاق سے سگنل نہیں ہوا تھا اور گاڑی اسٹیشن کے باہر ٹھہر گئی۔ وہ ڈبّہ ایک پُل پر رُکا جس کے نیچے ندی بہہ رہی تھی۔

اندھیرے میں جو کچھ ہوا وہ صاف ظاہر ہے۔ وہ سب کے سب پلیٹ فارم پر اُترنے کی بجائے سیدھے ندی میں جا گرے۔

فراڈ صاحب نے فوراً اس واقعہ کو قلمبند کر لیا۔ جب گاڑی رُکتی ہے تو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ پلیٹ فارم آ گیا ہے۔ چنانچہ یہ ایک لاشُعوری حرکت تھی جو تحت الشُعور کے زیرِ تحت ہوئی تھی۔

ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم اس کتاب سے کچھ اور واقعات نقل کریں لیکن کاغذ کی قلّت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ آخر میں ہم صرف ایک حادثہ اور نقل کریں گے۔ یہ خود مصنّف کے ساتھ پیش آیا۔ مصنّف سیر و سیاحت کے سلسلے میں ایک محل نما مکان میں ٹھہرے۔ جو کمرہ انہیں سونے کے لیے دیا گیا اس کے متعلق

مشہور تھا کہ وہاں کوئی جِن رہتا ہے۔ چند قصّے مصنّف نے اور بھی سُنے لیکن کوئی قصّہ ایسا نہ تھا جو مصنّف کے تحت الشُعور پر اثر کر سکتا۔ چنانچہ انہوں نے کوئی پرواہ نہ کی۔ رات کے کھانے کے بعد جب ملازم مصنّف کو اس کمرے میں لے جا رہا تھا تو مصنّف نے پوچھا۔ "کیوں بھئی اس کمرے میں کبھی کوئی عجیب واقعہ بھی ہوا ہے؟"

ملازم بولا۔ "جی ہاں! آج سے بیس سال پہلے ایک نہایت ہی عجیب و غریب واقعہ ہوا تھا۔"

"وہ کیا تھا؟" مصنّف نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"یہی کہ ایک شخص جو رات کو اس کمرے میں سویا تھا دوسرے روز صبح کو زندہ پایا گیا۔" اور مصنّف غش کھا گئے۔

یہ بات ہی ایسی تھی جو مصنّف کے تحت الشُعور پر تیر کی طرح لگی۔ خود ہمیں ایک قصّہ یاد آ گیا۔ ایک مولانا تقریر کر کے آ رہے تھے۔ انہیں ایک صاحب سے ملایا گیا جس کی پتلون ذرا چھوٹی تھی اور ٹخنوں سے اُونچی تھی۔ مولانا نے پتلون کو دیکھا اور چہک کر بولے۔ "مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے شرعی پتلون پہن رکھی ہے۔"

ہم اس فقرے کو اور خصوصاً ''شرعی پتلون'' کی ترکیب کو قطعی نہ سمجھ سکے۔ لیکن اس کتاب کے مطالعے نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب ہمارے سامنے چودہ طبق روشن ہیں۔ اب ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کے تحت الشُعور میں شرع بسی ہوئی تھی۔ ورنہ کُجا شرع اور کُجا پتلون؟

کتاب کے ہر صفحے پر تحت الشُعور کا لفظ دس دس مرتبہ آتا ہے جو اس امر کی وکالت کرتا ہے کہ کتاب بے حد مفید اور دلچسپ ہے۔

کتاب کی عبارت نہایت ہی آسان اور عام فہم ہے۔ بچّے بھی بخوبی سمجھ سکیں گے۔ مثال کے طور پر چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''فکری ابہام اور چیز ہے اور ریاضیاتی استدلال اور چیز۔ بعض اوقات تشکّلی فضا میں حسّی بیداری اور حسّی تصورات ایک دوسرے پر منطبق ہو جاتے ہیں۔ یہ اَمر غیر اَغلب ہے کہ یہ منطبقیت قابلِ اسناد ہو۔ تاہم نفسیاتی زاویۂ نگاہ سے یہ معنوی ربط اور شعوری تحقیق ہماری توجّہ حواسِ خارجی کی جانب مبذول کراتے ہیں اور ہم خارجی عمل اور عمقِ نفس کی پیچیدگیوں میں غلطاں ہو جاتے ہیں۔ ہم اس

ترکیبِ نفسی پر محمول کریں یا ترغیبِ نفسی پر، لیکن ترتیبِ لاشُعوری ہمیں اس عبوری دور میں فرار پر مجبور کر دیتی ہے اور قلب روح میں ایک انتشاری کیفیت و ہیجان بپا کر دیتی ہے۔"

آخر میں مصنّف نے ایک مرتبہ پھر شعور کی اہمیت جتائی ہے۔ اب اسے ذرّے ذرّے میں تحت الشُعور کی کرشمہ آرائیاں نظر آتی ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ دنیا میں جتنے دنگے فساد ہوتے ہیں، جتنی شرارتیں ہوتی ہیں، جتنے جرائم ہوتے ہیں، سب میں تحت الشُعور کا ہاتھ ہے۔ اگر حامد محمود کی گائے چُراتا ہے تو اس میں حامد کا تحت الشُعور ناقص ہے یا محمود کا اور اگر ان دونوں کا نہیں تو پھر لازمی طور پر گائے کے تحت الشُعور میں خلل ہے۔

مصنّف نے شعور کے حق میں صدائے احتجاج بلند کی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندوستان میں تحت الشُعور کو سر آنکھوں پر بٹھایا جائے۔ اس پر آزاد نظمیں کی جائیں اور بھی زیادہ افسانے لکھے جائیں۔ اسے باقاعدہ تحریک بنا کر اس پر تقریریں ہوں۔ تحت الشُعور کے نقص کو مرض قرار دیا جائے۔ سب طبّی کتابوں میں اس کا ذکر ہو۔ اس مرض کا علاج دریافت کیا جائے۔ درخواستوں میں جہاں امیدوار اپنی عمر قد اور بینائی وغیرہ کی سرخیاں پُر کرتے ہیں وہاں ایک سُرخی تحت الشُعور کی بھی ہو۔

جس روز ہندوستان میں باپ اپنے بچّوں کو ماہرینِ تحت الشُعور کے پاس شُعور کی خرابی کی بنا پر لانے لگیں گے۔ اس روز مصنّف کے خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائیں گے۔

مصنّف نے لکھا ہے کہ وہ بہت جلد ''خواب اور تحت الشُعور'' کے نام سے ایک کتاب لکھنے والے ہیں۔ غالباً اسی لیے وہ آج کل دن کو بھی خواب دیکھ رہے ہیں۔

بہر حال ہمیں اس کتاب سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اور اسے ضرور پڑھنا چاہیے۔ ہم اس کتاب کی پُر زور سفارش تو نہیں کرتے لیکن امید کرتے ہیں کہ ترقّی پسند حلقوں میں یہ بے حد مقبول ہو گی۔

ہدایت نامہ طلباء

پیارے بچّو! آؤ ہم تمہیں چند مفید ہدایتیں دیں۔ ہم خود ایک عرصے تک طالبِ علم رہ چکے ہیں لیکن ہمیں کسی نے ایک بیش قیمت باتیں نہیں بتائیں۔ اسی لیے ہم نے امتحانوں میں کوئی خاص تیر نہیں مارے۔ بس پاس ہو جایا کرتے تھے۔ پھر اسے اپنی خوش نصیبی سمجھو کہ آج ہم تمہیں اپنے کئی سالہ تجربے کا نچوڑ بتا رہے ہیں۔ نہ نہ شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔

پہلی بات جو تمہیں ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے یہ ہے کہ ممتحن تمہارے پرچے کو حفظ کرنے کی نیّت سے کبھی نہیں پڑھتا۔ اسے بالکل فرصت نہیں ہے کہ وہ ایک ایک لفظ کا مطالعہ کرے۔ اگر فرصت ہو بھی تو ایک ہی جیسے اور ایک ہی مضمون کے پرچے بار بار پڑھ کر وہ اُکتا جاتا ہے۔ پہلے وہ خوشخطی کا جائزہ لیتا ہے۔ شروع کی چند سطریں پڑھتا ہے اور ساری عبارت پر ہائی جمپ کرتا ہوا آخری سطروں تک پہنچ جاتا ہے۔ انہیں بغور پڑھ کر نمبر لگا دیتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ممتحن صرف وہ باتیں تم سے پوچھے گا جو تمہیں نہ آتی ہوں۔ جو کچھ تمہیں آتا ہے وہ ہرگز نہیں پوچھے گا۔

پہلے یہ دو سنہری نصیحتیں اپنی گرہ سے مضبوط باندھ لو۔ باندھ لیں؟ اچھا! اب آگے چلتے ہیں۔

ایک دفعہ ہم امتحان دے رہے تھے۔ اُردُو کا پرچہ تھا۔ پہلے سوال میں یہ رُباعی تھی۔

گلشن میں پھروں کہ صحرا دیکھوں

یا معدن کوہ و دشت و دریا دیکھوں

ہر جا تیری قدرت کے لاکھوں جلوے

حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

رُباعی بالکل آسان تھی اور ہم بہت خوش ہوئے۔ لیکن آگے جو پڑھتے ہیں تو مندرجہ ذیل سوال پوچھے گئے تھے۔

1. شاعر کس سے مخاطب ہے اور کیوں مخاطب ہے؟ شاعر حیران کیوں ہے؟

2. سیر صحرا دیکھوں صحیح ہے یا غلط؟ اس کی جگہ سیر صحرا کروں، کیسا رہتا؟

3. معدن کوہ و دشت و دریا کس علاقے میں کثرت سے پائے جاتے ہیں؟

4. "آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں" کی پہلے گردان کرو، پھر اسے ماضی استمراری اور ماضی مجہول میں تبدیل کر کے ترکیبِ نحوی و حرفی کرو۔

5. شاعر انیس کی مفصّل سوانح عمری لکھو۔ اس کی شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالو۔

یہ پڑھ کر ہمارا ایسا جی چاہا کہ ۔۔۔ اچھا جانے دو اب کہنے سے کیا فائدہ؟

بچّو! ایسے ہی سوالات ممتحن اکثر پوچھتے ہیں۔ اس پر خفا ہونے یا کُڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ان کی عادت ہے۔

اب ہم چند مضامین کو باری باری لیں گے اور ہدایتیں دیں گے۔

جغرافیہ

بچّو! جغرافیہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ طبعی اور غیر طبعی۔

طبعی جغرافیہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ زمین گول ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر ایک آدمی اپنی ناک کی سیدھ میں چل پڑے اور دیواروں

اور چھتوں کو پھاندتا ہوا لوگوں کے گھروں میں سے گزرتا ہوا سیدھا چلا جائے تو وہ بہت جلد اُسی جگہ بھیج دیا جائے گا جہاں سے وہ روانہ ہوا تھا۔

ایک نظامِ شمسی بھی ہوتا ہے جس میں سورج اپنے گرد گھومتا ہے۔ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ چاند زمین کے گرد گھومتا ہے لیکن چاند غریب کے گرد کچھ بھی نہیں گھومتا۔ ہمیں چاند سے ہمدردی ہے۔ سارے ستارے چمکتے ہیں اور سیّارے سیر کرتے رہتے ہیں۔ ویسے نظام شمسی کے سارے ممبر صبح سے شام تک کچھ کام نہیں کرتے۔ اِدھر اُدھر آورہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ افواہ ہے کہ ان کے گھومنے سے موسم بدلتے ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ جب خُنکی بڑھ جائے تو سردی کا موسم آجاتا ہے اور جب دھوپ تیز ہو جائے تو گرمیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ طبعی جغرافیہ ہے۔

غیر طبعی جغرافیہ میں براعظم وغیرہ ہوتے ہیں۔ (یاد رہے کہ براعظم کا سکندرِ اعظم سے کوئی تعلق نہیں)۔ کئی بچّے محلِ وقوع اور حدودِ اربعہ کو آپس میں غلط ملط کر دیتے ہیں۔ کتنی افسوس ناک بات ہے (اگرچہ ہمیں بھی اس میں کچھ شُبہ سا ہے)۔ کئی بچّے جزیرہ نما کو قطب نما سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جزیرہ نما وہ چیز ہے جو کچھ کچھ جزیرہ سا ہو (جیسے بندر نما)۔ یعنی خشکی کا وہ قطعہ جو چاروں طرف پانی سے گِھرا ہو اور ایک طرف خشکی سے۔

ایک بچّے کو ہم نے جزیرے کی تعریف کرتے سُنا۔ جزیرہ پانی کا وہ قطعہ ہے جو چاروں طرف پانی سے گھرا ہوا ہو۔ یہ بالکل غلط ہے۔

پیداوار۔۔۔۔ بلا کھٹکے لکھ دو مکئی، جوار، باجرہ، نیشکر اور پوست کی کاشت ہوتی ہے ۔ کہیں کہیں گیہوں اور امرود کاشت کئے جاتے ہیں۔ زرخیز حصّوں میں چاول اور تربوز پیدا ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ دساور بھیجا جاتا ہے۔ سمجھ لو کہ جو چیز کاشت کی جائے گی زمیندار اس کو ہرگز استعمال نہیں کریں گے۔ یہ سیدھی دساور کو بھیج دی جائے گی۔(نوٹ: دساور کسی شہر کا نام نہیں ہے)

آب و ہوا۔۔۔۔ یاد رکھو کہ آب و ہوا مستقل چیز ہے اور موسم عارضی۔ لکھو کہ گرمیوں میں کافی گرمی پڑتی ہے۔ کبھی کبھی بارش کا چھینٹا پڑ جاتا ہے تو موسم قدرے خوشگوار ہو جاتا ہے۔ سردیوں میں کافی سردی پڑتی ہے۔ لیکن کبھی کبھار اتنی سردی نہیں ہوتی۔ بارش کے موسم میں خوب بارش ہوتی ہے۔

بارشیں۔۔۔۔ ہندوستان میں ہوائیں ہمیشہ بحیرۂ عرب سے اُٹھتی ہیں۔ بعض حضرات نے دو چار ہوائیں خلیج بنگال سے بھی اُٹھتی دیکھی ہیں۔ یہ ہوائیں بخارات (بخار کی جمع ہے) سے لدی ہوئی آتی ہیں۔ اس لیے کافی گرم ہوتی ہیں۔ اُوپر اٹھتے ہی یہ سیدھی کوہ ہمالیہ کا رُخ کرتی ہیں۔ اِدھر کوہ ہمالیہ بھی منتظر رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زور کی ٹکّر ہوتی ہے اور موسلا دھار مینہ برستا ہے۔ جس

سے دریا پیدا ہوتے ہیں جو نہروں کی معرفت ملک میں آبپاشی کرتے ہیں اور پہاڑ کی مٹّی بنا کر ساتھ لاتے ہیں اور میدانوں میں بچھاتے رہتے ہیں تاکہ میدان پہاڑ بننے شروع ہو جائیں اور پہاڑ گھِس گھِس کر میدان رہ جائیں۔

تجارتی ہوائیں۔۔۔۔ یہ بڑی کارآمد ہوائیں ہیں۔ تجارت کے سلسلے میں تاجر جس سمت جانا چاہیں یہ فوراً اسی سمت میں چلنے لگتی ہیں۔

ساحل۔۔۔۔۔ وہاں سے شروع ہوتا جہاں سمندر ختم ہو جائے۔ سب سے زیادہ مفید ساحل وہ ہے جو کٹا پھٹا اور خستہ حالت میں ہو۔ کہتے ہیں کہ ایسا ساحل جہازرانی میں خوب مدد دیتا ہے (تعجّب ہے کہ لوگ پھاوڑے لے کر سارے ساحل کٹے پھٹے کیوں نہیں بنا دیتے)۔

لوگ۔۔۔۔۔ عموماً چراگاہوں میں بھیڑ بکریاں پال کر گزار کرتے ہیں یا کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ جغرافیہ میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ دفتروں اور کارخانوں میں آدمی کام نہیں کرتے۔

چرند پرند۔۔۔۔۔۔۔ اس کا جواب مفصّل دو۔ جتنے جانور اور پرندے یاد ہیں ان سب کے نام لکھ دو (اگر ہو سکے تو ان کی تصویریں بھی بنا دو)۔ نیچے نوٹ لکھ دو کہ

اس ملک میں جو جو چرند اور پرند نہیں پائے جاتے اور فہرست میں زائد ہیں ان کے نام کاٹ دیئے جائیں۔

تاریخ

پیارے بچّو! بادشاہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ معمولی اور اعظم۔ مثلاً اشوکِ اعظم، سکندرِ اعظم، قلندر اعظم، چقندر اعظم وغیرہ وغیرہ۔

یہ یاد رکھو کہ ہر اعظم کے عہد میں ایک سفیر باہر سے آتا ہے جو ہندوستان میں کئی سال رہتا ہے اور واپس جانے کا نام نہیں لیتا۔ بڑی مشکلوں سے واپس بھیجا جاتا ہے۔ اپنے ملک میں پہنچتے ہی وہ ایک سفر نامہ لکھتا ہے جس میں ہندوستان کی خوب تعریفیں کرتا ہے۔ لکھتا ہے کہ گیہوں دو پیسے من ہیں، چنے ایک روپیہ من اور گھی مفت تقسیم ہوتا ہے۔ جوار، باجرہ لوگ منّتیں کر کر کے خریداروں کو مفت دیتے ہیں۔ اور لوگ اس قدر ایماندار ہیں کہ اپنے مکانوں میں قفل نہیں لگاتے، یہاں تک کہ بعض لوگ تو اپنا سارا سامان گلیوں میں رکھ دیتے ہیں۔

اب رہا سنہ کا قضیہ، سو ہمیں سنہ نہ کبھی پسند تھے اور نہ ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ طلباء سے وہ باتیں پوچھی جاتی ہیں جو ان کی پیدائش سے کہیں پہلے واقع ہوئی تھیں۔

اکتفا یہیں نہیں کرتے بلکہ ساتھ ہی مہینہ تاریخ اور وقت بھی پوچھتے ہیں۔ اس لیے بچّو اس کا استعمال ہرگز مت کرو۔ اگر تم نے کہیں غلط سنہ لکھ دیا تو ممتحن صاحب ناراض ہو جائیں گے کیونکہ ان کے پاس پرچہ دیکھتے وقت تاریخ کی کتاب ہوتی ہے۔ اگرچہ سنہ وغیرہ تو ان کو بھی ایسے ہی یاد ہوتے ہیں)۔

قبل از مسیح کے واقعات پر زیادہ یقین نہ کرو۔ یہ سب سُنی سنائی باتیں ہیں۔ تین چار ہزار سال پہلے کی باتوں پر تو بالکل اعتبار نہ کرو کیونکہ اب تک صرف ۱۹۴۴ سال گزرے ہیں۔ بادشاہوں کے متعلق صفحے سیاہ کرنے سے پہلے تمہیں ایک بات ضرور معلوم ہونی چاہیے کہ وہ بادشاہ اچھا تھا یا بُرا۔ مثلاً اگر تم چندر گپت کو بُرا کہہ دو یا اکبر کے خلاف کچھ لکھ دو تو بخوبی اندازہ لگا سکتے ہو کہ تمہیں کتنے نمبر ملیں گے۔ اگر بادشاہ اچھا تھا تو یہ فارمولا استعمال کرو۔

لکھو۔۔۔ بادشاہ خود نہایت دلیر، خوبصورت، باہمّت، عقل مند، شہسوار، سخی اور رحمدل تھا۔ شیروں کا شکار اکثر کرتا تھا، شمشیر زنی کا ماہر تھا۔

پالیسی۔۔۔ پالیسی بھی کئی قسم کی ہوتی ہے۔ اندرونی، بیرونی، خارجی، داخلی، ملکی، غیر ملکی وغیرہ۔ لکھ دو کہ سب پالیسیاں نہایت ہی اعلیٰ اور لاجواب تھیں۔ رعایا نے سب کو پسند کیا۔

وزرا۔۔۔۔ اچھے بادشاہوں کے وزرا بھی بیدار مغز، محنتی اور ایماندار ہوتے ہیں۔ آخر صحبت کا اثر ہے۔

سیاسی خوبیاں۔۔۔۔۔ آس پاس کے ملکوں سے رابطۂ اتحاد قائم کیا۔ دشمنوں کو کبھی پیار سے زیر کیا، کبھی تلوار سے، کبھی دونوں سے۔نئے نئے قوانین بنائے۔ نئی نئی اصلاحات نافذ کیں۔ پُرانی اصلاحات کو ممنوع قرار دیا۔ رشوت کا قلع قمع کیا۔

بادشاہ رات کو بھیس بدل کر رعایا کا حال معلوم کرنے شہر میں پھرا کرتا تھا۔

لڑائیاں۔۔۔۔ جو جنگ بھی لڑی کامیابی نے قدم چومے اور فتح و نصرت کے ڈنکے بجاتا ہوا واپس لوٹا۔

عمارات۔۔۔۔ اچھے بادشاہ بے شمار عمارتیں، باغ اور سڑکیں بنواتے ہیں۔ اسی لیے ان کے عہد میں کوئی قحط نہیں پڑتا۔

لیکن بچّو! کیا یہ بے انصافی نہیں کہ قصور کسی کا ہو، نقشے کوئی بنائے۔ عمارت مزدور بنائیں اور نام بادشاہ کا ہو جائے۔ اس لیے تم چند معماروں اور مزدوروں کے نام بھی ساتھ لکھ دیا کرو۔

فنونِ لطیفہ۔۔۔۔ اچھے بادشاہ ہمیشہ فنونِ لطیفہ کے دلدادہ ہوتے ہیں اور ان کے عہد میں فنونِ لطیفہ کو خوب فروغ ہوتا ہے۔

اور اگر وہ بادشاہ بُرا تھا تو لکھو:

اُس کے دماغ میں کچھ خلل سا تھا۔ نہایت ہی عیش پسند اور آرام طلب تھا۔ اُس کے درباری بے حد خوشامدی اور مکّار تھے۔ وہ خود ہر وقت شراب کے نشے میں مدہوش رہتا تھا (یہ الزام تم بلا کھٹکے لگا سکتے ہو)۔ اس نے اسی ایسی سیاسی غلطیاں کیں کہ رعایا بدظن ہو گئی (سیاسی غلطیوں کا نام ہرگز نہ لینا) نئے نئے ٹیکس لگائے اور رعایا سے خوب روپیہ اینٹھا۔ اس کے عہد میں دن دیہاڑے چوریاں ہوتی تھیں۔ ڈاکے پڑتے اور طوائف الملوکی زوروں پر تھی (طوائف الملوکی کے معنی آج تک ہم نہیں سمجھ سکے۔ بہر حال تم ضرور لکھ دو)۔ اس نے آس پاس کے ملکوں اور دُور دراز کی سلطنتوں سے بگاڑ پیدا کر لیا جس سے سپاہی بیزار ہو گئے۔ سرحد پر شورشیں شروع ہو گئیں۔ ہر صوبے کے صوبیدار نے (کہیں غلطی سے صوبیدار میجر نہ لکھ دینا) علمِ بغاوت بلند کیا اور مرتے دم تک اس کا وقت بغاوتیں دبانے میں گزرا (یہاں اس کے انتقال کا سن ہرگز مت لکھنا ورنہ پکڑے جاؤ گے)۔

اور اگر کسی بادشاہ کی کوئی پالیسی مفصّل طور پر دریافت کی جائے تو ایسا گول مٹول جواب دو کہ جس میں بہت سے بادشاہوں کے نام جگہ جگہ آتے ہوں۔ مثلاً اگر اکبر کی بیرونی پالیسی پوچھی جائے تو لکھو:

پیشتر اس کے کہ ہم اکبر کی بیرونی پالیسی پر بحث کریں ہمیں ہنری ہشتم کی خارجہ پالیسی اور اشوک کی غیر ملکی پالیسی کو نہیں بھولنا چاہیے جو اس قسم کے حقائق کی شاہد ہیں۔ تعجّب ہے کہ بالکل وہی نکتے ہمیں چندر گپت کی اندرونی پالیسی میں ملتے ہیں جو مدّتوں پہلے اس عالی دماغ نے سوچے تھے۔ اکبر کی بیرونی پالیسی کچھ کچھ علاؤالدین خلجی کی مشہور و معروف اصلاحات پر بھی منطبق ہو جاتی ہے۔ خود شمس الدین التمش نے ایک مرتبہ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ہمیں شُبہ ہے کہ ہارون الرشید کی مشہور پالیسی اور جولیس سیزر کے خود ساختہ قوانین کا اثر اکبرِ اعظم پر پڑا ہے۔ چنانچہ ایک حد تک۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

خاندان کے نام سے بھی کچھ اندازہ لگا لیا کرو اور اس کے مطابق چند سطریں جواب میں اور شامل کر دیا کرو۔ مثلاً

موریا خاندان: ان بادشاہوں کو موروں کا بہت شوق تھا۔

غوری خاندان: کے بادشاہ ہمیشہ غور کرتے رہتے تھے۔

خاندانِ غلاماں: نام سے ہی صاف ظاہر ہے۔

سورج بنسی خاندان: سورج کے سامنے بیٹھ کر بنسی بجاتے تھے۔

الجبراء

سُنو بچّو! الجبرا بنی نوع انسان کے سب سے بڑے محسن مولانا جبر بخش نے دریافت کیا تھا۔ کیا جبر بخش کا نام تم نے نہیں سنا؟ تو کس کا سُنا تھا؟ جبر اللہ کا! خیر تو اس نے دریافت کیا ہو گا۔ ہم اکثر سوچتے رہتے ہیں کہ اگر الجبرا نہ ہوتا تو دنیا کا کیا حشر ہوتا۔

الجبرے کے موٴجد نے ایک روز یہ دریافت کیا کہ اگر ترازو کے پلڑوں میں ہم وزن چیزیں ڈال دی جائیں تو پلڑے برابر رہتے ہیں۔ اس نے یہ تجربہ کئی سال تک مختلف ترازوؤں پر کیا۔ اس کی موت پر کوئی تین چار سو ترازو اس کے گھر میں سے نکلے (لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان میں اکثر چُرائے ہوئے تھے)۔

اب مثلاً ایک ترازو ہے، ایک پلڑے میں ایک اُونٹ اور ایک بکری ہیں اور دوسرے میں اُونٹ اور بھیڑ اور پلڑے برابر ہیں۔ اگر ہم دونوں اُونٹ نکال لیں تب بھی برابر رہتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ یا تو ترازو میں کوئی نقص ہے اور یا

دونوں اُونٹ ہم وزن ہیں۔ بچّو! یہ تجربہ یاد رکھو۔ اسی پر الجبرے کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ الجبرے کو آسان بنانے کے لیے 'لا' استعمال کیا جاتا ہے جو شروع میں نامعلوم ہوتا ہے۔ اس کا دریافت کرنا بے حد ضروری ہے۔ محض اسی مقصد کے لیے الجبرا بنایا گیا ہے۔ اگر خدانخواستہ کہیں 'لا' نہ ہوتا تو الجبرا ابھی نہ ہوتا۔

مثلاً اگر یہ سوال ہو:

لا + ۵ ریچھ = ۶ اُلّو + ۷ شتر مرغ

تو کئی صفحے سیاہ کرنے کے بعد کچھ اس قسم کا جواب آئے گا۔

لا = ۵ کبوتر - ۳ بٹیر + ۸ لومڑیاں۔

ظاہر ہے کہ اس کے بغیر الجبرے کا کوئی سوال حل نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر ہم ایک آسان سا سوال الجبرے کی کتاب سے نقل کرتے ہیں۔

"ایک اُودبلاؤ کی عمر اتنی ہے جتنی اس کے چچا کی چھ سال پہلے تھی۔ اس کے چچا کی عُمر پانچ سال بعد اُودبلاؤ کی موجودہ عمر سے دگنی ہو جائے گی۔ اُودبلاؤ اور اس کے کی عُمروں میں آج سے سات سال بعد اتنا ہی فرق ہو گا جتنا اس کے چچا کی عُمر میں سے اُس کی عمر نکال کر اس کے چچا کی موجودہ عمر دگنی کر کے جمع کر دی جائے۔ دونوں کی عمریں ملا کر اُودبلاؤ کی عمر سے چار گنا ہیں اور تین سال پہلے اتنی

تھیں جتنی کہ اُودبلاؤ کے چچا کی عمر چار سال بعد ہو گی جبکہ اس کی عمر اُودبلاؤ کی عمر سے۔۔۔۔۔“

اب یہ الجبرے کا ایک بالکل سادہ سوال ہے۔ یہاں ہمیں صرف 'لا' دریافت کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ الجبرے کے بغیر اُودبلاؤ کی عمر دریافت نہیں ہو سکتی اور اس کے دریافت نہ ہونے سے اُودبلاؤ کی مایوسی کے علاوہ بنی نوع انسان کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

الجبرا سیکھنے کے لیے ترازو کی سخت ضرورت ہے۔ کسی نہ کسی طرح پانچ چھ ترازو اکٹھے کر لو اور ہر روز ایک بیس فٹ مربع کمرے میں بیٹھ کر کتابیں، چھڑیاں، برتن، گھر کی بلّی، کوئی چھوٹا موٹا بچّہ۔۔۔ دونوں پلڑوں میں رکھ کر پلڑوں کو برابر کرنے کی کوشش کرو۔ ساتھ 'لا' کا استعمال بھی جاری رکھو۔ بہت جلد تم محسوس کرنے لگو گے کہ تم الجبرا سیکھ رہے ہو۔

'لا' کو دریافت کر کے دل کو سرور اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ قصّہ مختصر الجبرا نہایت کارآمد چیز ہے۔ دس منٹ روزانہ الجبرا جگر، دماغ اور معدے کو تقویت دیتا ہے اور بیس منٹ روزانہ الجبرے سے پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں اور قد بھی بڑھتا ہے۔

حساب

بچّو! ہمیں افسوس ہے کہ ہم حساب میں تمہیں زیادہ ہدایتیں نہیں دے سکتے کیونکہ ہم سوالوں کے جواب اِدھر اُدھر سے پوچھ کر سوال حل کیا کرتے تھے۔

لیکن ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ اگر تم بار بار یہ کہہ سکتے ہو کہ "فرض کیا۔۔۔"تو تم بہت جلد حساب دان بن جاؤ گے۔

اُردُو

اُردُو میں جواب مضمون ہوتے ہیں۔ شعروں کے معنی پڑھے جاتے ہیں یا الفاظ کو فقروں میں استعمال کرایا جاتا ہے۔

جواب مضمون لکھنا بالکل آسان ہے، اگر تمہیں ہماری نصیحت نمبر ایک یاد ہے۔ یعنی یہ کہ ممتحن سارا جواب مضمون ہرگز نہیں پڑھتا۔ چنانچہ اگر عنوان ہو 'ورزش کے فوائد'، تو شروع میں ورزش کا ایک آدھ فائدہ جو تمہیں یاد ہو لکھ دو۔ اس کے بعد ایک لمبی سی کہانی لکھ مارو، بے شک بے موقعہ ہو۔ کہانی کے آخر میں لکھ دو۔ پس ثابت ہوا کہ ورزش کے بہت سے فائدے ہیں اور ورزش نہایت ہی مفید چیز ہے۔ اگر اپنے جواب مضمون میں تم چند اقوال بھی شامل کر دو تو سبحان اللہ۔ وہ اقوال فرضی ہوں، جعلی ہوں، کچھ بھی ہوں، لیکن ان کے ساتھ بڑے

بڑے آدمیوں کے نام ہونے ضروری ہیں۔ مثلاً۔۔۔ شیکسپیئر لکھتا ہے کہ ورزش نہایت مفید چیز ہے۔ ملٹن نے اپنی کتابوں میں بار بار ورزش کے فوائد دہراتے ہیں۔ مشہور چینی عالم کنفیوشس ہر وقت ورزش کرتا رہتا تھا۔

اب رہے شعروں کے معنے۔۔۔ شعروں کے معنے کرتے وقت پہلے یہ فقرہ ضرور شامل کرو۔۔ "شاعر کہتا ہے کہ"۔۔۔ اگر اتفاق سے شاعر کا نام بھی یاد ہو تو ادب سے کام لو اور لکھو "فلاں صاحب فرماتے ہیں کہ۔۔۔۔۔" اپنی طرف سے اور کچھ شامل نہ کرو بس شعروں کو کھینچ کر سیدھا کر دو اور سیدھی سادی نثر بنادو۔ مثلاً۔۔۔۔۔

مری مجبوریاں کیا پوچھتے ہو

کہ جینے کے لیے مجبور ہوں میں

کے معنی اس طرح لکھو۔ شاعر کہتا ہے کہ تم لوگ میری مجبوریاں کیا پوچھتے ہو، میں تو جینے کے لیے مجبور ہوں۔ بس! اس سے زیادہ تشریح کی کوئی ضرورت نہیں۔

پیارے بچّو! عاشق اور معشوق کے ذکر سے ہمیشہ پرہیز کرنا۔ ورنہ ماسٹر صاحب خفا ہو جائیں گئے۔ ہم نے ایک بچّہ دیکھا جو شعروں کے معنے کرتے وقت ہمیشہ فقرہ یوں شروع کرتا تھا۔ عاشق اپنے معشوق سے کہتا ہے کہ۔۔۔۔۔

یہاں تک کہ جب اس کو یہ شعر سنایا گیا۔

الٰہی ہمیں ایسی توفیق دے

کہ بن جائیں ہم نیک بندے ترے

تو اس نے معنی یوں بیان کیئے۔ عاشق اپنے معشوق سے کہتا ہے کہ تو ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم تیرے نیک بندے بن جائیں۔

بچّو! ایسی غلطی کبھی مت کرنا۔ ورنہ تمہارا بھی وہی حشر ہو گا جو اس بچّے کا ہوا۔ وہ بچّہ آج کل شاعر ہے۔

اب رہا الفاظ اور محاروں کو فقروں میں استعمال کرنا۔ سو تم ان الفاظ اور محاوروں کو کسی دوسرے کی زبان سے کہلوادو مثلاً:

(الفاظ) سکونِ قلب۔ طوفانِ مسرّت۔

(فقرہ) تب بوڑھے نے مُسکرا کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔۔۔۔ "اُف سکونِ قلب! آہ طوفانِ مسرّت!"

(محاورہ) نو نقد نہ تیرہ اُدھار۔

(فقرہ) سوداگر ناراض ہو کر بولا۔ "معاف کیجئے حضرت میں تو کھرا آدمی ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ نو نقد نہ تیرہ اُدھار۔"

(محاورہ) سو سُنار کی ایک لوہار کی۔

(فقرہ) حامد کچھ دیر تو کُشتی دیکھتا رہا پھر محمود سے بولا۔ "بھئی یہ تو وہی معاملہ ہے کہ سونار کی ایک لوہار کی۔"

ہمیں یقین ہے کہ تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو گئے۔ آخر میں ہم یہ ضرور کہیں گے کہ کہیں کہیں جان بوجھ کر گھُنّے بھی بن جایا کرو اور ہلکی پھلکی چوٹیں کر جایا کرو۔ تھکا ہوا ممتحن تمہارے ایسے جوابوں سے یقیناً خوش ہو گا۔ ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

ایک بچّے سے زبانی امتحان میں پوچھا گیا۔۔۔ "کوئی اسم بتاؤ۔"

بچّے نے کہا۔ "کتّا!"

"کوئی اور اسم بتاؤ"

جواب ملا۔ "کوئی اور کتا!"

ممتحن بے حد خوش ہوا اور عرصے تک خوش رہا۔

ایک بچّے نے بھوت کی تعریف یوں کی۔ "بھوت ایک ایسی غیر مادی چیز ہے جو صرف رات کو ہی نظر آسکتی ہے۔" اور کالی گھٹا کی یوں تعریف کی۔ "کالے بادل سیاہ پانی کے بخارات کا مجموعہ ہیں۔" اور ایک سوال کا جواب یہ دیا۔ "اگر بیس فٹ آئس برگ سمندر کی سطح کے اُوپر ہو تو باقی کا آئس برگ سمندر کی سطح کے نیچے ہوگا۔" تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس بچّے کو کتنے نمبر ملے ہوں گے۔

اچھا بچّو! ہم اس ہدایت نامے کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ ہم کئی اہم مضامین اور بہت سی ہدایات چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن اس وقت ہمیں اتنا کچھ ہی یاد تھا۔ بعد میں کچھ اور یاد آ گیا تو ہدایت نامہ طلباء کا دوسرا حصّہ ضرور لکھیں گئے۔ وعدہ رہا۔

چاء

وہ صبح سے عجیب عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔ کبھی لمبے لمبے سانس لیتا، کبھی دھڑام سے صوفے پر گر کر آنکھیں میچ لیتا۔ کبھی دیدے مٹکا مٹکا کر کرسی پر طبلہ بجاتا۔ پھر یکایک چھلانگ مار کا آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور کچھ اس انداز سے آئینہ دیکھتا جیسے آج زندگی میں پہلی مرتبہ آئینہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ دو ایک مرتبہ اس نے باغ کا رُخ بھی کیا۔ لیکن چند آہیں بھر کر جلدی سے واپس آ گیا۔

کوئی دیکھ لیتا تو اسے سچ مُچ دیوانہ سمجھتا۔ لیکن وہ دیوانہ نہیں تھا، وہ عاشق تھا۔ اور آج محبوب نے اسے پانچ بجے بلایا تھا۔ آج اس کے دل میں شدید طوفان بپا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پانچ چھ سو سال سے عاشق ہے۔

اس کے سامنے کپڑوں کا انبار پڑا تھا۔ لباس کا انتخاب بھی مصیبت تھی۔ کبھی سوچتا شیروانی پہنوں۔ کبھی خیال آتا کہ سوٹ بہتر ہو گا۔ پھر جی للچایا کہ کالج کا بلیزر ہی کیوں نہ پہن لیا جائے۔ اسی رسّہ کشی میں تین بج گئے اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ یکایک اُسے خیال آیا کہ ایک دن اس کے بلیزر کی تعریف ہوئی تھی۔

لیکن بلیزر تو گرم ہے۔ بھلا مئی میں بھی کوئی بلیزر پہنتا ہے لیکن اپریل تک تو سب پہنتے تھے۔ چلو کیا ہوا ابھی ابھی تو مئی شروع ہوئی ہے۔

ساڑھے چار ہے وہ بن ٹھن کر نکلا۔ باہر اچھی خاصی گرمی تھی۔ اس نے جیب میں پڑی ہوئی انگوٹھی کو ٹٹولا اور مسکرانے لگا۔ اور جو آج یہ انگوٹھی پہنا دوں تو؟

آخری دفعہ جب ملاقات ہوئی تھی تو کیسی پیاری پیاری باتیں ہوئی تھیں۔ بولی ابّا جان سے ضرور ملئے۔ پوچھا کیا ضروری ہے؟ بولی ہاں بہت ضروری ہے۔ پوچھا کیوں بھلا؟ تو چُپ ہو گئی۔ دراصل ہندوستان میں تو ابّا جان کے حکم کے بغیر ایک پتّا بھی نہیں ہل سکتا۔ محبّت میں ابّا ایک اہم ترین جزو ہیں۔ محبّت ابّا کی مرضی کے مطابق کی جاتی ہے اور ان کی مرضی کے مطابق گھٹائی بڑھائی جا سکتی ہے۔ اسی لیے وہ آج مجھے اپنے ابّا سے ملانا چاہتی ہے۔ عجب اتفاق ہے کہ تین سال سے میں اس لڑکی کو جانتا ہوں۔ لیکن اس کے ابّا سے نہیں ملا۔ ہندوستان میں یہ معجزے سے کم نہیں۔

ویسے آج اُن سے ملنے کا سنہری موقعہ ہے۔ کیونکہ دو تین ہفتوں تک یہ لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس کی نگاہ سامنے دیوار پر چلی گئی۔ لکھا تھا۔ گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ نیچے پانچ پیالیوں کی تصویر بنی ہوئی تھی اور لکھا تھا۔ ایک پیسے میں چاۓ کی پانچ پیالیاں تیار ہوتی ہیں۔۔۔ کیا لغویت ہے؟

گرمیوں میں گرم چیز کس طرح ٹھنڈک پہنچا سکتی ہے ؟۔۔۔ کون یقین کرے گا؟ اگر یہ صحیح ہے تو پھر گرمیوں میں تپتی ہوئی دھوپ بھی ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ گرمیوں میں آگ کے سامنے بیٹھنے سے سکون ملتا ہے اور گرمیوں میں گرم کپڑے خنکی پہنچاتے ہیں۔۔۔ اور یہ پانچ پیالیوں والا مذاق بھی ایک ہی رہا۔ اشتہار دینے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ چاۓ میں صرف اُبلتا ہوا پانی ہی نہیں ہوتا بلکہ دودھ اور شکر بھی ڈالتے ہیں۔

وہ پانچ بجے سے ذرا پہلے پہنچ گیا۔ پھاٹک پر اس نے ٹائی کی گرہ درست کی۔ بال سنوارے، چہرے پر ایک دلآویز مسکراہٹ پیدا کی اور اندر داخل ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ انتظار ہو رہا ہو گا۔ لیکن برآمدے میں کوئی نہ تھا۔ کوٹھی بھی سنسان پڑی تھی۔

وہ برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ جب دیر تک کوئی نہ آیا تو اس نے زور سے آہٹ کی۔ اندر سے آواز آئی۔ ''بلّی!'' اور پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ بدستور ٹہلتا رہا۔ یکایک پردہ ہلا۔ کوئی آ رہا ہے۔ وہ دوبارہ مسکرانے لگا۔ اتنے میں پردہ ہٹا اور ایک موٹا تازہ کتّا باہر نکلا۔ اُسے نیم باز آنکھوں سے دیکھتا ہوا بڑی بے نیازی سے گزر گیا۔ کاش کہ یہ بھونک ہی دے۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ کتّا کسی طرح بھونک دے۔ لیکن کتّے نے اس کی طرف دوبارہ توجّہ ہی نہیں کی۔

اس کے بعد اس نے بہتیرے جتن کئے۔ کئی مرتبہ زور زور سے کھانسا۔ سیڑھیوں پر زور زور سے اُترا چڑھا۔ آخر تنگ آکر ستون کے پاس رکھی ہوئی بالٹی زور سے پٹخ دی۔ اندر سے کوئی چلایا۔ ''کھڑی رہ مُردار۔ ابھی تیری خبر لیتی ہوں۔'' خادمہ باہر آئی۔

''گول کمرے میں تشریف رکھئے۔'' وہ بولی۔

''اور وہ کہاں ہیں؟'' اس نے ذرا شرماتے ہوئے پوچھا۔

''وہ ابھی سو رہی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔

ابھی سو رہی ہیں؟۔۔۔ اس نے گھڑی دیکھی پورے پانچ بجے تھے۔ خیر انتظار کر لیں گے۔ یہ گول کمرے میں جا بیٹھا۔ لیکن یہ سونے کا کون سا وقت ہے؟ اور یہ گول کمرہ کس مسخرے نے نام رکھا ہے۔ اچھا بھلا چوکور کمرہ ہے۔ آج تک کبھی ایسا کمرہ دیکھنے میں نہیں آیا جو گول ہو۔ اور یہ پنکھا نہایت ہی سست رفتار ہے۔ چل کیا رہا ہے، گویا احسان کر رہا ہے۔ ہوا تو نام کو نہیں آ رہی۔ ساری ہوا چھت کی طرف جا رہی ہے۔ غالباً کسی نے اُلٹا لگا دیا ہے۔ بڑی گرمی ہے۔ پسینہ آ رہا ہے۔ بلیزر اُتار دینا چاہیے۔ لیکن کیا پتہ وہ لوگ کب آ جائیں۔ اب پہنے ہی رہتے ہیں۔ لیکن پانچ بج چکے ہیں، کوئی نظر نہیں آتا۔

چاء کا وقت بھی ہو گیا ہے۔ کچھ تو چہل پہل ہونی چاہیے۔ سب کے سب کہیں باہر تو نہیں چلے گئے یا شاید سو رہے ہوں۔ خادمہ کو گئے کافی دیر ہو گئی۔ ممکن ہے کوئی جاگ اُٹھا ہو۔ اس نے میز پر رکھا ہوا گُلدان لڑھکا دیا۔ دوسرے کمرے سے کوئی چلایا۔۔۔۔ "بلّی!"۔۔۔ یہ کیا مصیبت ہے؟ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس گھر میں انسانوں سے زیادہ بلیلاں آباد ہیں۔ یا یہ خادمہ کی بچّی جان بوجھ کر کہتی ہے۔

دروازہ کھلا اور خادمہ آئی۔ پوچھا تو کہنے لگی۔ "ابھی سو رہی ہیں۔ کیا اتنی جلدی اُٹھ کھڑی ہوں؟ آپ انتظار کیجئے۔"

تو ابھی سو رہی ہیں۔ سبحان اللہ! کس سادگی سے فرمایا ہے۔ سوا پانچ بجنے کو آئے اور ابھی تک سو رہی ہیں۔ لیکن مجھے بلایا کیوں تھا۔ جو لڑکی اتنی دیر تک سو سکتی ہے اسے کیا کہیں کیا نہ کہیں۔ لازمی طور پر اس نے دوپہر کو جی بھر کے مُرغّن لنچ کھایا ہو گا۔ شاید خرّاٹے بھی لے رہی ہو۔ خراٹے لینا کس قدر غیر رومانی حرکت ہے۔ کم از کم میں تو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر سونے کا پروگرام تھا تو بھلا مجھے بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور وہ اس کے ابّا کہاں ہیں؟ وہ بھی دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ فرما رہے ہوں گے۔

آخر یہ تماشا کیا ہے؟ آج اپریل کی پہلی تاریخ بھی نہیں۔ پھر مجھے بیوقوف کیوں بنایا گیا۔

ابّا جان سے ملاؤں گی (مُنہ چڑا کر) جیسے ابّا جان تڑپ ہی تو رہے ہیں مجھ سے ملے بغیر۔ نہ جانے میں کب تک اُلّو بنا رہوں گا۔ اپنے خوابوں سے کب جاگوں گا۔ صبح محبّت، شام محبّت، اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے بس محبّت ہی کا خبط رہتا ہے۔ ساری دنیا سے میں محبّت کرتا ہوں اور ساری دنیا میرے فراق میں نڈھال ہے۔

میاں ذرا عقل کے ناخن لو جان بوجھ کر اُلّو نہ بنو۔ کسی کی محبّت اور کیسی محبّت۔ آخر تم ہو گیا۔ نہ کسی کو آپ سے محبّت تھی اور نہ ہے۔ اور آپ اچھے خاصے بیوقوف بھی ہیں۔ مئی میں جو شخص گرم بلیزر پہنے وہ بیوقوف نہیں تو اور کیا ہے۔

اور یہ جو تم خودداری خودداری چوبیس گھنٹے ہانکتے رہتے ہو۔ کہاں گئی وہ خودداری؟ فوراً یہاں سے چل دو۔ دیکھ لیں گے کیا ہو گا۔ کوئی مَر تو نہ جائیں گے اس محبّت کے بغیر۔ اور پھر یہ محبّت ہی کہاں ہے؟ یہ تو سو فیصدی حماقت ہے۔ چلو اب اُٹھو کافی احمق بن چکے۔ لیکن جانے سے پہلے عہد کر لو کہ پھر کبھی اس مکان میں قدم نہیں رکھو گے۔ لیے پھرتے ہیں مکان۔۔۔۔ گول

کمرہ۔۔۔۔۔۔لعنت ہے اس پر جو آئندہ اس مکان کی طرف رُخ بھی کرے۔ دو تین ہفتوں تک یہ لوگ یہاں سے دفع ہو جائیں گے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ آنکھ او جھل پہاڑ او جھل۔ قصّہ ختم ہو گا۔

وہ چل دیا۔ راستے میں خادمہ ملی۔

بولی۔ "آپ کہاں تشریف لے جارہے ہیں؟"

جی میں آیا کہہ دیں۔ "جہنم میں۔"

"آپ کب تشریف لائیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"قیامت تک نہیں۔" اس نے دل میں کہا۔

پھاٹک سے گزرتے وقت اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر انگوٹھی کو مسل دیا۔ دل چاہا کہ اسے کہیں دُور پھینک دے۔ خیر ابھی نہیں۔ ویسے میں اسے کہیں نہ کہیں ضرور پھینک دوں گا۔ اس کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل اس کی ضرورت تھی ہی نہیں۔ یونہی خرید لی۔ میں بڑا فضول خرچ ہوں۔ تبھی تو ہمیشہ مقروض رہتا ہوں۔ ایک طالب علم کو سونے کی انگوٹھی نہیں خریدنی چاہیے۔

اب وہ سڑک پر چل رہا تھا۔ اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر راہگیر اس کے بلیزر کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ دفعتاً ایک تانگا بالکل اسے چھُوتا ہوا بڑی تیزی سے گزر گیا۔ غصّے سے اس کا بُرا حال ہو گیا۔ چلا کر بولا۔ ”ابے او دیکھ کر نہیں چلتا۔“ پھر کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ سڑک پر یوں چلّانا تو مئی میں گرم بلیزر پہننے سے بدتر ہے۔ کہیں شریف آدمی بھی ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔

وہ چوک سے گزر رہا تھا کہ ایک دم بہت سی موٹریں آ گئیں اور راستہ رُک گیا۔ وہ درمیان میں پھنسا کھڑا تھا۔ نہ جانے سب سے اگلا ڈرائیور کیوں کھڑا ہے۔ موٹر چلاتا کیوں نہیں۔ وہ غصّے سے تلملا اُٹھا۔ جی میں آیا کہ آگے بڑھ کر ایک دھپ دے ڈرائیور کے۔ آگے بڑھا بھی لیکن موٹر چل دی۔

تین چار پرندے آپس میں لڑتے لڑتے بالکل اس کے سر پر آ بیٹھے۔ ہاتھ سے جھٹک کر اس نے پیچھا چھڑایا۔ یہ کم بخت پرندے! نامعقول کہیں کے۔ جنگلوں میں جا کر کیوں نہیں مرتے۔ شہر میں نہ جانے کیوں تنگ کرنے آ جاتے ہیں۔ ان کا بہترین علاج ہی ہے کہ بندوق لے کر صبح سے شام تک ان کی مزاج پُرسی کرو۔ تب یہ سیدھے ہوں گے۔

ایک سینما ہاؤس آیا۔ دروازے پر بہت بڑا اشتہار چسپاں تھا۔ ”زندہ ناچ و گانا“ جیسے کوئی مُردہ ناچ و گانا بھی ہوتا ہو۔ یہ اشتہار بھی سخت مہمل قسم کا ہے اور

ساتھ ہی ہدایات دُم چھلّے کی طرح لگی ہوئی ہیں۔ دنگافساد کرنے والا حوالہ پولیس کیا جائے گا۔ سگریٹ پینے والے کو جیل میں بند کر دیا جائے گا۔ شراب پینے والے کو ملک بدر کر دیا جائے گا۔

توبہ توبہ آج گرمی کس قدر ہے؟ مئی میں اس قدر گرمی؟ غضب خدا کا یہ موسم بھی نہایت غیر یقینی چیز ہے۔ مئی میں اتنی گرمی ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ عجب بے تُکا موسم آرہا ہے۔ یہ دنیا بھی کیسی مصیبت کی جگہ ہے۔ اگر خودکُشی آسان ہوتی تو آج ضرور کی جاتی۔

اب وہی چاۓ کا اشتہار آیا۔ وہاں ایک کیفے تھا جو چاۓ کے لیے مشہور تھا۔ گھڑی دیکھی تو چھ بجنے والے تھے۔ پہلے سوچا چلو سیدھے چلیں۔ پھر خیال آیا کہ آج سہ پہر کو چاۓ نہیں پی، یہیں پی لیتے ہیں۔ وہ اندر چلا گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر انتظار کیا لیکن کوئی نہیں آیا۔ سوچنے لگا کہ ہماری قسمت خراب ہے جہاں انتظار کرتے ہیں کچھ نہیں ملتا۔ اس نے آواز دی۔ ”بہرہ۔“ چند بہروں نے اس کی طرف دیکھا ضرور لیکن وہ سب مصروف تھے۔ کوئی نہ آیا۔

”بہرہ“ وہ زور سے چلّایا۔ اس مرتبہ بھی کوئی نہ آیا۔

”بہرہ آ آ!“ وہ پورے زور سے چیخا۔ سامنے بیٹھے ہوئے ایک صاحب بولے۔ ”جناب! جب وہ غریب ہے ہی بہرہ تو اسے سُنائی خاک دے گا۔ آپ ناحق خفا ہوتے ہیں۔“

ایک قہقہہ پڑا۔ اس کے جی میں آیا کہ ایک تیز سا جواب دے کہ اتنے میں بہرہ آگیا۔ خوب مُسکرا رہا تھا۔ آتے ہی بولا۔ ”چاء یا کافی؟“

”چاء کافی ہوگی۔“ اس نے جواب دیا۔

”آپ چاء پئیں گے یا کافی؟“ بیرے نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اس میں ہنسی کی کیا بات ہے؟“

”جی نہیں، ہنس تو نہیں رہا ہوں۔“

”پھر یہ بتّیسی کیوں دکھا رہے ہو؟“

”باتیں کرتے وقت بھی نظر آ ہی جاتی ہے۔“ بیرا مؤدبانہ بولا اور غصّے سے اس کا خون کھولنے لگا۔ ایسا جی چاہا کہ بیرے کو جان سے مار ڈالے۔ بڑی مشکل سے ضبط کیا اور بولا۔ ”چاء لاؤ۔“ بہرا چلا گیا۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بے شمار لوگ بیٹھے تھے۔ تقریباً سب کے سب مُسکرا رہے تھے۔ کچھ تو سچ مُچ ہنس رہے تھے۔ یہ لوگ مُسکرا کیوں رہے ہیں؟ جو بلا وجہ دانت نکالے وہ توزہر دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ ریڈیو کم بخت یہاں بھی موجود ہے۔ اس وقت بھاؤ بتائے جارہے تھے۔ بیلوں کی جوڑی اسّی روپے چار آنے تین پائی۔ گایوں کی جوڑی۔۔۔ لنگوروں کی جوڑی۔۔۔ طوطوں کی جوڑی۔۔۔ آخر یہ سب کے سب چُپ چاپ بیٹھے یہ خرافات سُن کیوں رہے ہیں؟ کوئی جا کر ریڈیو بند کیوں نہیں کر دیتا۔ یا کم از کم اسٹیشن ہی بدل دے۔ یہ کیفے بھی دن بہ دن بیہودہ ہوتا جارہاہے۔ آئندہ یہاں قدم نہیں رکھوں گا۔

اتنے میں چاۓ آ گئی۔ ایک پیالی بنائی اور پینے لگا۔ چسکی لے لے کر پہلی پیالی ختم ہوئی۔ دفعتاً اس نے ایک عجیب وغریب تبدیلی محسوس کی۔ جیسے وہ سوتے سوتے جاگ اٹھاہو۔ جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا ہو۔

پہلے چاروں طرف اندھیرا سا تھا اب اندھیرا دُور ہو رہا تھا اور روشنی آرہی تھی۔ اسکی بینائی بھی تیز ہوتی جارہی تھی۔ اب وہ دُور دور کی چیزیں صاف دیکھ سکتا تھا۔

دوسری پیالی شروع کی۔ بھاؤ ختم ہو چکے تھے اب ریڈیو پر کوئی گانا ہو رہا تھا۔ کوئی پکّا راگ تھا۔ پھر بھی اس کا سر مٹکنے لگا۔

تیسری پیالی پر جیسے کوئی اس کے دماغ میں گُدگُدیاں کرنے لگا۔ وہ مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ سچ مُچ مُسکرانے لگا۔ اس کے جسم میں یکلخت چُستی آگئی۔ کسی نے اس کی روح کو اوور ہال کر دیا۔ بیرا آگیا، اس سے چند مذاق کیے۔ کچھ دیر بیٹھا مُسکراتا رہا۔ جب باہر نکلا تو دیکھا کہ عجب سہانا سماں ہے۔ یہ دنیا تو بڑی دلچسپ جگہ ہے۔ کائنات مُسکراتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ چھلانگیں مارے، قلا بازیاں کھائے یا کم از کسی سے لڑ ہی پڑے۔

ایک جگہ دیوار پر لکھا تھا۔ "اشتہار لگانے والا گرفتار کیا جائے گا!"۔۔۔ عین اسی جگہ ایک حضرت اشتہار چپکا رہے تھے اور چند حضرات اشتہاروں کے پلندے لیے منتظر تھے۔ اور باقی ساری دیوار خالی پڑی تھی۔ اس کی مسکراہٹ اور بھی بڑھ گئی اور سارے چہرے پر پھیل گئی۔ اسے خود ہمیشہ "سگریٹ پینا منع ہے" پڑھ کر سگریٹ پینا یاد آتا تھا اور وہ فوراً سگریٹ سلگا لیا کرتا۔ یہ انسانی فطرت بھی خوب مزے کی چیز ہے۔ اگر فرصت ہو تو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

اب وہ خوب تن کر چل رہا تھا۔ مٹھیاں بھینچ کر۔ پھر اس چوک میں پہنچا جہاں سے ایک سڑک ان کی کوٹھی کو جاتی تھی۔

ٹھہر کر سوچنے لگا۔ چلو ایک چکر اور لگا آئیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ابھی تو عہد کیا تھا۔ قسم کھائی تھی، اب ہرگز نہ جائیں گے۔ لیکن جانے میں کوئی خاص ہرج تو ہے نہیں۔ چلو خدا حافظ ہی کہہ آئیں۔ کچھ دنوں تک تو وہ لوگ چلے ہی جائیں گے۔ اور جو آج یہ توہین ہوئی ہے۔ اس کے بعد جاؤ گے؟ غرضیکہ چند منٹ کشمکش رہی۔ دل نے کہا مولانا ضد مت کرو۔ چڑچڑے مت بنو۔ چلو ایک چکر لگا آتے ہیں۔ آنے جانے میں کون سے ہاتھی گھوڑے لگتے ہیں۔ اب چلو۔

چوروں کی طرح وہ کوٹھی میں داخل ہوا۔ وہاں سب منتظر تھے۔ برآمدے میں کُنبے کا کُنبہ راہ دیکھ رہا تھا۔ بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا گیا۔ اس سے معافی مانگی گئی۔ خادمہ کو خوب ڈانٹا گیا کہ اس نے انتہائی بدتمیزی سے کام لیتے ہوئے اسے گول کمرے میں کیوں بٹھائے رکھا جبکہ چار بجے سے سب کے سب دوسری طرف باغیچے میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔

جب وہ رات گئے واپس ہوا تو اس کا رواں رواں خوشی سے ناچ رہا تھا۔ تنہائی میں باتیں بھی ہوئیں۔ انگوٹھی بھی قبول ہو گئی اور ایک چُوڑی بھی ملی۔ جو خاص طور پر اُتاری گئی تھی۔ اس کے ابّا سے خوب باتیں ہوئیں۔

وہ مُسکرا رہا تھا۔ اس کے دل میں مسرّت تھی اور چال میں رقص۔ یکایک ایک ایسا خیال آیا جس نے اس مسرّت پر اوس سی ڈال دی۔ اگر وہ آج دوبارہ نہ جاتا تو، تو کیا ہوتا؟ ایک مرتبہ تو وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ واپس نہیں جائے گا۔

وہ کون سی طاقت تھی جو اسے دوبارہ کھینچ کر لائی؟ محبّت کی طاقت؟ ہرگز نہیں۔ پھر کون سی طاقت تھی؟ شاید چاۓ کی پتّیاں! چاۓ کی چند پتّیاں جن کو اُبال کر وہ شکر اور دودھ کے ساتھ پی گیا تھا۔ غضب خدا کا آج شام کو جو کچھ ہوا۔ اس کے لیے وہ چاۓ کی چند پتّیوں کا ممنون ہے۔ اگر وہ آج چاۓ نہ پیتا تو غالباً اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا دنیا کی ہر چیز کو کوس رہا ہوتا۔

چاۓ اور محبّت کیا واقعی محبّت میں چاۓ ضروری ہے؟ چاۓ کے بغیر محبّت کرنا ناممکن ہے۔ چاۓ دریافت ہونے سے پہلے بھی تو لوگ محبّت کرتے ہوں گے۔ بھلا شیکسپیئر نے یہ بھی لکھا کہ سہ پہر ہوتے ہی رومیو جولیٹ کی نظر بچا کر چاۓ پینے چلا گیا۔ یا یہ کہ دن ڈھلا ہو اور مجنوں ایک تیز رفتار اُونٹ پر سوار ہو نجد کے صحرا سے سیدھا قہوہ خانے چاۓ پینے چلا گیا ہو یا فرہاد نے چار بجے نہر کھودنا ملتوی کر دیا ہو اور شیریں سے درخواست کی ہو کہ اے گلستانِ حسن و خوبی! ذرا سی چاۓ تو پلوائیے!

اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ جو تین سال سے اسے خبط تھا یہ اصلی اور خالص عشق نہیں تھا۔ اس مشینی دور کا مشینی عشق تھا۔ جس میں بہت سی چیزوں کو دخل ہے۔ جس میں موسم کے تغیّر کو دخل ہے۔ موڈ کو دخل ہے۔ ابّا جان کی مرضی کو دخل ہے اور ساتھ ہی چاء کو بھی!

اگر یہ واقعی عشق تھا تو لعنت ہے۔ اس نے اپنے آپ کو خوب بُرا بھلا کہا۔ محبّت کا سارا دعویٰ معنوں میں باطل ہو گیا۔ محض اس لیے کہ یہ سہ پہر کو چاء پینا بھول گیا تھا۔

وہ اُسی کیفے کے قریب پہنچ گیا۔ چاء کے دونوں اشتہار روشنی میں چمک رہے تھے۔ چلو ایک مرتبہ اور چاء پی لیتے ہیں۔ اگرچہ پینے کا کوئی وقت تو نہیں ہے پھر بھی پی لیتے ہیں۔

اس نے دوبارہ اشتہاروں کو پڑھا اور جیسے ہتھیار ڈال کر کہا۔ واقعی گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے بلکہ منجمد کر کے رکھ دیتی ہے۔ اور ایک پیسے میں پانچ پیالیاں کیا دس پیالیاں بن سکتی ہیں۔ اگر چاء کے کچھ اور مطالبات ہوں تو وہ بھی آج میں بلا چُوں وچرا مان لوں گا۔

یہ سوچتا ہوا وہ کیفے میں داخل ہو گیا۔

نوٹ:اس مضمون کو چاء کا اشتہار ہر گز نہ سمجھا جائے۔

فنِ لطیف

اگرچہ اس امر کا باقاعدہ اعلان تو نہیں ہوا لیکن یہ حقیقت ہے کہ فنِ اشتہار بازی کو عرصے سے فنونِ لطیفہ میں شامل کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ دوسرے ملکوں میں فنِ موسیقی اور فنِ مصوّری کے ساتھ ساتھ فنِ اشتہار بازی کی بھی تعلیم دی جاتی ہے اور بڑے بڑے اشتہار باز پیدا ہوتے ہیں۔ ویسے یہ فن دنیا کے قدیم ترین فنون میں سے معلوم ہوتا ہے۔

اہرامِ مصر کی تعمیر کے وقت مصر بھر میں "معماروں کو مژدہ" کی سُرخی کے اشتہارات تقسیم ہوئے ہوں گے۔ کولمبس نے امریکہ دریافت کرنے سے پہلے اس مضمون کے پوسٹر دیواروں پر چسپاں کئے ہوں گے۔ "ضرورت ہے! سیّاحِ اعظم حضرت کولمبس صاحب کے لیے جفاکش اور محنتی ملّاحوں کی جوان کو ایک

نئے برِّاعظم کی تلاش میں مدد دے سکیں۔ تنخواہ قابلیت کے مطابق۔ ملّاح درخواستوں کے ساتھ اپنے سرٹیفکیٹ ضرور بھیجیں۔"

ہیون سانگ نے ہندوستان سے واپس جاکر اپنے سفرنامے کی اشتہار بازی یوں کی ہوگی۔

"چھپ گیا! چھپ گیا! چین کے مشہور ترقّی پسند سیّاح کا سفرنامہ جس میں ہندوستان کے دلچسپ حالات، وہاں کے باشندوں کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں اور طرح طرح کی افواہیں شامل ہیں۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب، مصوّر سرورق سے مزیّن، مصنّف کا کارٹون بھی شامل ہے۔ دیباچہ مشہور چینی ادیب حضرت چوں چیاؤں پنگ پانگ نے لکھا ہے۔ جلد منگوایئے ورنہ پہلے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

طوفانِ نوح آنے سے پہلے شہر کے قاضی نے جلّی حروف میں یہ مضمون شاہراہوں میں لکھوادیا ہوگا۔

"آرہا ہے! آرہا ہے! اس شہر میں پہلی مرتبہ ایک طوفانِ عظیم! جو دیکھنے سے تعلّق رکھتا ہے۔ اگلے ماہ دوشنبہ سے طوفان کا پہلا ہفتہ شروع ہوجائے گا۔ ہمیں ایک بہت بڑی کشتی کی ساخت کے لیے نمونے درکار ہیں۔ سربمہر ٹینڈر بھیجے

جائیں۔ ساتھ ہی جانوروں اور پرندوں کا ایک ایک جوڑا درکار ہے۔ ضرورت مند حضرات توجّہ فرمائیں۔"

قدیم ہندوستانی تہذیب میں بھی اشتہار بازی کے چند نادر نمونے ملتے ہیں۔ یہاں ہم صرف وہ اشتہار پیش کریں گے۔

پہلا اشتہار تو مشہور گوّیے تان سین کا ہے۔ مضمون ملاحظہ ہو۔

"ریگستان کے کاشتکاروں کو خوشخبری۔۔۔۔۔۔۔

اگر بارش وقت پر نہ ہو اور فصلیں سوکھ رہی ہوں تو اپنا اُونٹ بھیج کر تان سین صاحب کی خدمات حاصل کیجئے۔ جو میگھ ملہار گا کے منٹوں میں چھاجوں مینہ برسا دیں گے۔ نیز اگر کوئی صاحب کہیں آگ لگوانا چاہیں تو وہ بھی صاحب موصوف سے خط و کتابت کریں اور خط میں دیپک راگ کا حوالہ دیں۔ ایسی خط و کتابت صیغۂ راز میں رکھی جائے گی۔"

دوسرا اشتہار تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

تاریخِ ہندوستان کے مشہور "بادشاہ گر" تو آپ نے سُنے ہوں گے۔ دو بھائی تھے کچھ ایسا ہی نام تھا ان کا، کُچھ برادرز، ان حضرات نے سلطنت میں جو دھاچوکڑی

مچائی تھی۔ یہ سب کو یاد ہی ہو گی جسے چاہے بادشاہ بنا دیتے جسے چاہتے تخت سے اُتار دیتے۔

یہ جہاں بھی جاتے، چھپے ہوئے فارم تقسیم کرتے جن کی عبارت ہم نقل کئے دیتے ہیں۔

"ع پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

بادشاہ بننے کا نادر موقعہ! کیا آپ بادشاہ بننا چاہتے ہیں؟ اگر چاہتے ہیں تو مندرجہ ذیل سرخیوں کو پُر کر کے مذکورہ فیس کے ہمراہ فوراً بھیجئے۔

1. نام، عمر، قد، مزاج، صحت، شادی شدہ ہو یا نہیں۔
2. کیا پہلے بھی کبھی بادشاہ بنے ہو؟ اگر بنے تھے تو کس سلسلے میں اور کتنے دن حکومت کی؟ اور اب تک زندہ کیونکر ہو؟
3. کتنے روز حکومت کرنا چاہتے ہو۔ (کم سے کم عرصہ لکھو)۔
4. ایک عہد نامہ بھیجو کہ بادشاہ بن کر ہمارے اشاروں پر ناچو گے۔ ہمارے ارشاد پر استعفیٰ دے دو گے۔ کسی قسم کی اصلاحات نہیں کرو گے اور سلطنت کے کسی کام سے واسطہ نہ رکھو گے۔

5. مرنا کسی طرح پسند کروگے؟

(الف) پھانسی (ب) قتل (ج) فصیل سے گرایا جانا (د) ہاتھی کے پاؤں تلے آجانا (س) زہر کھانا۔ (یہ سوال ضروری ہے۔ ایک طریقہ ضرور منتخب کرکے لکھنا ہوگا)

لیکن آج کل ملک میں یہ فن بڑی تیزی سے زوال کی طرف جارہا ہے اور کسی کو اس کا احساس تک نہیں۔ ہر روز 'جھوٹے پر خدا کی لعنت'، 'مراد آباد میں مردہ زندہ ہوگیا'، 'نقّالوں سے بچو'، 'آپ کو خدا کی قسم ضرور پڑھئے'، 'اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا'، 'منظور ہے گزارشِ احوال واقعی' پڑھ پڑھ کر ہم تنگ آ چکے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان سرخیوں سے ہم ازل سے آشنا ہیں۔

ہمیں مغربی اشتہار بازی کے مطالعے کا اتفاق ہوا۔ تب ہمیں اپنی حالت پر افسوس ہوا۔ عبداللہ سگریٹ لندن کے مشہور سگریٹ ہیں۔ بلیک آؤٹ میں کوئی سگریٹ نہیں پی سکتا۔ ٹریم میں سفر کرتے وقت اس اشتہار پر اکثر نظر پڑ جاتی ہے۔

"بلیک آؤٹ میں سگریٹ پینا منع ہے۔ یہاں تک کہ عبداللہ سگریٹ کی بھی ممانعت ہے۔"

واللہ کیا لطیف اشتہار ہے؟ اس کے مقابلے میں "قینچی مار کہ سگریٹ پیا کرو" والے اشتہار کو لیجئے، مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"کھانسی کے لیے اکسیرِ کھانسی استعمال کرو؟" ایسا ہے جیسے کسی کے سر پر لٹھ مار دیا۔ نہ اس فقرے میں کوئی جاذبیت ہے، نہ ملائمت ہے۔

ہم نے ایک رسالے میں کارٹون دیکھا جس میں کوئی ڈاکٹر ربڑ کی نلکی سے مریض کے سینے کا معائنہ کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "کھانسو" مریض مسمّی شکل بنا کر کہتا ہے "صاحب! میں معذور ہوں۔ بالکل نہیں کھانس سکتا۔ ابھی ابھی میں نے ایلن بری کی کھانسی کی گولیاں کھائی ہیں۔"

اس اشتہار کا اثر پر ہم پر یہ ہوا کہ ہم فوراً بازار سے ایلن بری کی گولیاں لائے اور کھانسی کا انتظار کئے بغیر شیشی ختم کر ڈالی (گولیاں میٹھی تھیں)۔

پھر ورزش کی کتاب کا اشتہار دیکھا جس میں ایک مشہور انگریز مصنّف کی یہ رائے درج تھی:

آج سے چند ماہ پہلے ایک بد ہضمی کا مارا ہوا شخص بازار میں جا رہا تھا۔ وہ شخص ڈھیلے بھدّے جسم اور کئی ٹھوڑیوں کا مالک تھا۔ نہ اسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہ دنیا کے کاموں سے۔ وہ صحیح معنوں میں زندگی سے بیزار تھا۔ دفعتاً ایک دکان میں اسے ورزش کی یہ کتاب نظر آئی اور اس نے خرید لی۔ اسے پڑھ کر آدھ گھنٹے روزانہ ورزش کے بعد ڈیڑھ مہینے میں نہ صرف اس کا کافی وزن گھٹ گیا اور توند کم ہو گئی بلکہ زندگی کی گزشتہ دلچسپیاں نئے سرے سے عود کر آئیں۔ گویا اس عمر سے کسی نے بیس سال گھٹا دیئے۔ یہ واقعہ بالکل صحیح ہے اور میں بڑے وثوق سے اس کی تصدیق کر سکتا ہوں کیونکہ وہ ڈھیلا ڈھالا اور بیزار شخص میں ہی تھا۔

ایک کیفے کے باہر ایک بہت بڑی تصویر تھی جس میں ایک بچھڑا گائے کے سامنے کھڑا ضد کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے ”ذرا اچھلئے کودیئے۔“

گائے نے جھلّا کر کہا۔ ”آخر کیوں؟“

بچھڑے نے جواب دیا۔ ”میرا جی ملک شیک کو چاہ رہا ہے۔“

اس کے نیچے ملک شیک کی مختلف قسموں کا اشتہار تھا۔

چاکلیٹ کی ایک مشہور کمپنی یوں اشتہار دیتی تھی۔ "تھی" اس لیے کہ ان دنوں عمدہ چاکلیٹ کا ذکر ماضی تمنائی میں کرنا پڑتا ہے۔ ایک میچ میں کھیل ہو رہا ہے۔ بیشمار تماشائی بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔ ایک صاحب ایک دروازے سے ایک گائے لئے چلے آرہے ہیں۔ لوگ ان کو بُری طرح گھورتے ہیں۔ نیچے لکھا ہے۔

اگر آپ دودھ کے شوقین ہیں اور کرکٹ میں اپنی گائے ہمراہ نہیں لے جاسکتے تو کیا ہوا۔ ہماری کمپنی کے چاکلیٹ ساتھ لے جایئے جو خالص گائے کے دودھ سے تیار کئے جاتے ہیں۔

ایک مشہور فرم کا اشتہار بے حد مقبول ہے۔ یہ فرم مکانوں کو فرنیچر اور جملہ ساز وسامان سے آراستہ کرتی ہے۔ ان کا اشتہار ہمیشہ ایک فقرے کا ہوتا ہے۔ "آپ فقط شادی کر لیجئے باقی سب انتظام ہمارے ذمّے رہا۔"

ہمیں سودیشی اشتہاروں میں دو بہت پسند آئے۔ ایک دکان کا نام تھا۔ "آپ کی دکان"۔ دوسرا اشتہار الیکشن کی چپقلش میں دیکھا۔ شہر میں صرف دو امیدوار تھے۔ فرض کیجئے ایک کا نام تھا بیربل اور دوسرے کا مُلّا دوپیازہ۔ ایک عرصے سے وہ ایک دوسرے کے خلاف شور مچا رہے تھے۔ انتخاب کا نتیجہ خدا جانے کیا نکلا لیکن اشتہار بازی میں بیربل صاحب نے مُلّا دوپیازہ کو پچھاڑ کر رکھ دیا۔ انہوں نے شہر بھر میں چھوٹی چھوٹی کتابیں تقسیم کروائیں۔ کتاب کا نام تھا 'حضرت مُلّا

دوپیازہ کی قومی خدمات۔"کتاب کے سب صفحے خالی تھے۔فقط آخری صفحے پر لکھا تھا۔"اب تک تو مُلّا دوپیازہ صاحب نے ملک کی کوئی خدمت نہیں کی۔ہاں آئندہ کچھ کیاتو ہم بخوشی درج کر دیں گے۔"

ایک پکچر کے ساتھ کارٹون دیکھا۔نہایت ہی رنگ برنگا اور دلچسپ کارٹون تھا۔ سورج کو اپنے بستر میں آرام کرتے دکھایا گیا۔ وہ زور زور سے خراٹے لے رہا ہے۔ ایک فرشتہ آتا ہے اور سورج کے کمرے کے باہر یہ نوٹس لگا دیتا ہے۔ "آج طلوعِ آفتاب چھ بج کر پانچ منٹ پر ہو گا۔" ساڑھے پانچ کے الارم بجاتا ہے۔ لیکن سورج جلدی سے ٹائم پیس بند کر کے سو جاتا ہے۔ پونے چھ بجے سورج کا نوکر چاۓ لاتا ہے۔ سورج آنکھیں کھول کر دو چار انگڑائیاں لیتا ہے اور دوبارہ سونے کی کوشش کرتا ہے۔ نوکر کے بار بار جگانے پر مچل کر کہتا ہے۔ "آج ہماری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ جاؤ سب سے کہہ دو آج ہم اپنی مرضی کے مطابق اُٹھیں گے۔"

نوکر کہتا ہے۔ "غضب ہو جائے گا حضور۔ باہر نوٹس لگ چکا ہے۔ صبح کا ستارہ مجھے الگ تنگ کر رہا ہے۔ آپ کے اُٹھنے پر اسے چھٹّی ملے گی۔ چاند رات بھر نہیں سویا۔ اُدھر دنیا والے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔؟"

سورج چلّا کر کہتا ہے۔ "ہمیں دِق مت کرو۔ ایک دفعہ کہہ دیا ہے کہ نہیں اُٹھیں گئے۔ بس جاؤ۔"

اُدھر دنیا میں سورج کا انتظار ہو رہا ہے۔ کلیاں، پھول، پتّے سب جھوٹ موٹ خرّاٹے لے رہے ہیں۔ ویسے سب جاگ رہے ہیں اور بار بار کَن انکھیوں سے مشرق کی طرف دیکھتے ہیں۔ تتلیاں بے تاب ہیں، پرندے جانور آدمی سب منتظر ہیں۔ لوگ اپنی گھڑیوں پر جھنجھلا رہے ہیں۔ اتنے میں چند لاریاں آتی ہیں اور بجلی کے بلب جگہ جگہ لگا دیتی ہیں۔ اس قدر روشنی ہو جاتی ہے کہ سورج کی ضرورت نہیں رہتی۔ ساری کائنات جاگ اُٹھتی ہے اور دن اپنے ہنگامے اور شور وغل کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔

ساتھ اس اس کمپنی کا نام بھی پردے پر آ جاتا ہے جس کے بلب ہیں۔ صرف کارٹون کے آخر میں ہمیں پتہ چلا کہ یہ تو اشتہار تھا۔

کارٹونی اشتہار بہت پسند کئے جاتے ہیں۔ ایک تو مختصر ہوتے ہیں اور دوسرے پُرمذاق۔

ایک کارٹون تھا کہ اسٹیشن پر ایک گاڑی آکر رُکتی ہے۔ ایک شخص گارڈ سے ملتا ہے اور سگار پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ”میں پندرہ سال سے یہاں ہوں۔ آج تک کبھی یہ گاڑی وقت پر نہیں آئی۔ ہمیشہ لیٹ آئی ہے۔ آج پہلا موقعہ ہے کہ وقت پر آئی ہے۔“

گارڈ کہتا ہے۔ ”قبلہ یہ سگار اپنے پاس ہی رکھئے، یہ کل کی گاڑی ہے۔“

نیچے لکھا ہے۔ ”آپ اس جھنجھٹ میں پڑتے ہی کیوں ہیں، ہماری بس سروس سے سفر کیجئے جو کبھی لیٹ نہیں ہوتی۔“

امریکن پرچون میں بڑے دلچسپ اشتہار ہوتے ہیں۔ ایک اشتہار ملاحظہ ہو:

”آپ کے کتّے کی قسمت!

کتّے کا نام اور تاریخ پیدائش بھیج کر اس کی زندگی کے حالات اور قسمت معلوم کریں۔“

ایک گائے کی فروخت کے سلسلے میں ایک صاحب لکھتے ہیں:

"ایک نجیب الطرفین، شریف الطبع، بے حد ذہین اور بلند خیالات کی گائے، برائے فروخت! یہ گائے حیوانی حُسن کا نادر نمونہ ہے۔ اس کی آنکھیں چشمِ آہو کو مات کرتی ہیں۔ اس کی کمر اتفاق سے چیتا دیکھ پائے تو اپنی کمر سے اس قدر شرمائے کہ فوراً کہیں جا کر ڈوب مرے۔ ملک کے سر سبز مرغزاروں اور لالہ زاروں میں پروان چڑھی ہے۔ قابل ترین گوالوں کے زیرِ سایہ اس کی تربیت ہوئی ہے۔ وقت کی پابند، نیک خصلت، مزاج کی حلیم۔۔۔۔" وغیرہ وغیرہ۔

ایک اور نیا طریقہ یہ ہے کہ ایک تصویر بنا کر نیچے لکھ دیتے ہیں کہ بتایئے اس تصویر میں پانچ فاش غلطیاں کون کون سی ہیں۔ تصویر میں کئی غلطیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک بچّہ پنجرے میں بند ہے اور اسے چوری کھلائی جا رہی ہے۔ ایک صاحب کانٹے چھری سے چاء پی رہے ہیں۔ ایک صاحب بجلی کے بلب سے سگریٹ سلگانے کی کوشش کر رہے ہیں

اشتہار کے آخر میں لکھا ہے، "اس اشتہار میں یوں تو بیشمار غلطیاں ہیں لیکن سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ چاء کی میز پر ہمارے مشہور و معروف بسکٹ موجود نہیں ہیں۔"

ریڈیو پر جو تقریریں ہوتی ہیں ان میں بھی اشتہار بازوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ مقرروں سے طے کرلیتے ہیں اور مقرر اپنی تقریر کچھ اس طرح ختم کرتا ہے۔

"خواتین و حضرات! اب میں آپ کو شب بخیر کہہ کر گھر جاؤں گا اور سونے سے پہلے فلاں بُرش اور فلاں منجن سے اپنے دانت صاف کروں گا۔ یہ دونوں چیزیں دنیا میں بہترین ہیں" یا یہ کہ "میں فلاں سگریٹ پیوں گا جو بہترین سگریٹ ہے۔"

سینما میں بھی اسی طرح کیا جاتا ہے۔ ہیرو وہی سگریٹ پیئے گا جس کا اشتہار سگریٹ کی کمپنی دینا چاہتی ہے۔ ہیروئن کار میں بیٹھے گی یہ وہی کار ہوگی جس کے اشتہار کے لیے معاوضہ دیا گیا ہے۔

لیکن "منظور ہے گزارشِ احوال واقعی" پڑھتے ہی نہ جانے کیوں دل گواہی دینے لگتا ہے کہ جو کچھ نیچے جڑی بوٹیوں کے متعلق لکھا ہے وہ جھوٹ ہے۔

"پھر نہ کہنا خبر نہ ہوئی" پڑھ کر ہم دل میں دہراتے ہیں کہ اچھا نہیں کہیں گے اور اشتہار نہیں پڑھتے۔

ایک اور سُرخی ہے۔ ”مت پڑھے، ورنہ آپ بھی ہماری طرح بادشاہی مہندی پر عاشق ہو جائیں گے۔“

دوسری سرخی ہے۔ ”آپ کو خدا کی قسم یہ سطریں ضرور پڑھیے!“

عجیب کشمکش میں پڑ جاتے ہیں، کسے خوش کریں اور کسے ناراض۔

”مبلغ پچاس ہزار روپے نقد انعام۔“ پڑھتے ہی ہمیں یقین سا ہو جاتا ہے کہ یہ انعام نہ تو آج تک کسی کو ملا ہے اور نہ انشاء اللہ قیامت تک ملے گا۔

”کہتی ہے ہم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا“ کو ہم ہمیشہ غلط پڑھتے ہیں۔ اس کو الگ پڑھتے ہیں اور 'نہ کیا' الگ یعنی غالب نہ کیا۔ سوچتے ہیں کہ غائب کر دیتے تو بہتر تھا۔

مراد آباد کا نام سنتے ہی ہمیں وہ مُردہ یاد آجاتا ہے جو زندہ ہو گیا تھا اور غالباً ہر روز زندہ ہوتا ہے۔ بڑا جی چاہتا ہے کہ دیکھیں تو سہی مُردہ کیونکر زندہ ہوا تھا؟ کس سلسلے میں زندہ ہوا تھا؟ ہمّت کر کے یہ طویل اشتہار پڑھ ہی ڈالیں۔ لیکن آج تک یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

”اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا“ کی سُرخی دیکھتے ہی ہمارا دل گھبرانے لگتا ہے اور جی میں آتا ہے کہ اخبار چھوڑ چھاڑ کر کہیں بھاگ جائیں۔ بچپن سے ہم

اس اشتہار کو جُوں کا تُوں دیکھ رہے ہیں۔ اسے پڑھا تو ہم نے آج تک نہیں لیکن یہ یقین ہے کہ اس میں ایک حرف کی ردّوبدل نہیں ہوئی۔

شادی کے اشتہار پڑھ پڑھ کر اب ہمیں ہر لڑکی پڑھی لکھی، تندرست، قبول صورت، سگھڑ، امورِ خانہ داری میں ماہر اور کفایت شعار معلوم ہوتی ہے۔ اور ہر نوجوان صحت مند، شریف نیک چلن، تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار نظر آتا ہے اور ہر کُنبہ اعلیٰ، مشہور اور کھاتا پیتا دکھائی دیتا ہے۔

کاش کہ فنِ اشتہار بازی کو ترقّی دینے کی کوشش کی جائے اور اس فن کا بغور مطالعہ کیا جائے۔

اشتہاروں میں جدّت ہو، مزاح ہو، دلچسپیاں ہوں۔

کسی قدرتی نظارے کی آمیزش ہو جیسے۔۔۔۔

”جب مغرب میں سورج غروب ہوتا ہے تو بڑے چوک میں سُرخ گنبد کا سایہ تھرتھراتا ہوا حاجی کریم بخش اینڈ سنز کی دکان تک جا پہنچا ہے اور شیشوں میں سے جھانک کر طرح طرح کے کھلونوں کو دیکھتا ہے جو شہر بھر سے سستے ہیں۔“

کوئی اچھا سا شعر آجائے۔ مثلاً

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یہ شعر واقعی نہایت اچھا شعر ہے کیونکہ یہ امتحانوں کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر آپ بھی کوئی امتحان دے رہے ہوں تو لالہ دین دیال اینڈ برادرز کے ہاں سے خلاصے خریدیئے۔

کسی لطیفے کی چاشنی ہو سکتی ہے۔

اُستاد نے قطب شمالی اور رینڈ ئیر کا ذکر کرتے ہوئے ایک بچّے سے پوچھا۔ ”بتاؤ وہ کون سا جانور ہے جو سردیوں میں پوشاک عطا کرتا ہے اور گرم رکھتا ہے۔ سواری مہیا کرتا ہے اور خوراک کا انتظام کرتا ہے۔“

بچّے نے جواب دیا۔ ”ابّا جان۔“

بچّے کا جواب غلط ہے یا صحیح یہ آپ خود سوچ لیجئے۔ لیکن آپ کو پوشاک، اشیائے خورد و نوش، حجامت کا سامان، الغرض جس چیز کی بھی ضرورت ہو ہمارے سٹور میں تشریف لائیے۔

ایک آدھ کہاوت بھی آجائے۔

"مثل مشہور ہے کہ دُور کے ڈھول سہانے۔۔۔ لیکن ہمارے ڈھول نزدیک سے بھی سہانے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ ہمارے ہاں اعلیٰ درجے کے ڈھول، طبلے، مردنگ اور سارنگیاں خریدیئے۔"

وغیرہ وغیرہ۔

شیطان اور کوہِ ہمالیہ

رات کے نو بجے تھے۔ کلب میں پروفیسر جالینوس کا لیکچر تھا۔ موضوع کچھ ایسا تھا کہ آخر میں 'آت' آتا تھا۔ جمادات، سیاسیات، نباتات۔ میں نے گھڑی دیکھی اور شیطان بولے۔ ”گھڑی گھڑی گھڑی مت دیکھو۔“

پروفیسر صاحب کو لیکچر شروع کئے بمشکل آدھ گھنٹہ گزرا ہو گا لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے برسوں سے بول رہے ہیں۔ سننے والے جمائیاں لے رہے تھے۔ میں نے بڑی ترکیب سے وقت دیکھا۔ اور شیطان نے پھر کہا۔ ”کہہ جو رہا ہوں کہ گھڑی گھڑی مت دیکھو، گھڑی کی طرف۔“

”تو پھر کیا کروں؟۔۔۔ اچھا جب لیکچر ختم ہو جائے گا تو جگا دینا۔“ اور میں کرسی پر باقاعدہ لیٹ گیا۔

شیطان جھلّا کر بولے۔ ”سب تمہیں دیکھ رہے۔ تم سوٴ مت۔ میں لیکچر ابھی ختم کرائے دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر شیطان نے بڑی تیزی سے اپنی گھڑی دیکھنی شروع کر دی۔ غالباً ایک منٹ میں پندرہ بیس مرتبہ۔ اور ہر بار اس انداز سے کلائی آنکھوں کے سامنے لاتے کہ سب دیکھ لیں، بار بار گھڑی کو کان کے پاس لے جا کر سنتے کہ کہیں بند تو نہیں ہو گئی۔ اس کے بعد کلائی کو خوب جھٹکتے۔ پروفیسر جالینوس کا لیکچر اپنے شباب پر تھا۔ یکایک انکی نگاہ شیطان پر پڑ گئی۔ بولے ”خواتین و حضرات! مجھے احساس ہے کہ میں آپ کا کافی وقت ضائع کر چکا ہوں۔ لیکن میرے پاس گھڑی نہیں ہے اور نہ اس کمرے میں کوئی کلاک ہے۔ اس لیے وقت کا اندازہ۔۔۔۔؟“

”کوئی بات نہیں۔“ شیطان بولے۔ ”داہنے ہاتھ ایک کیلنڈر لگا ہوا ہے اسے استعمال فرمایئے۔“

پروفیسر صاحب اسی جوش و خروش سے بول رہے تھے۔ بلکہ پہلے سے بھی کچھ تیز ہو گئے۔ اس وقت گھوڑوں کے متعلق کچھ کہہ رہے تھے۔ دفعتًہ انہوں نے کڑک کر کہا۔ ”آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ گھوڑے کے احساسات کیا ہوں گے؟“

یہ کہہ کر حاضرین کی طرف دیکھا۔ ایک مرتبہ پھر یہی فقرہ دہرایا تو شیطان اُٹھ کر بولے۔ ”صاحب مجھے کیا پتہ، مجھے گھوڑا بننے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔“

شور ختم ہوتے ہی پروفیسر صاحب پچاس الفاظ فی سیکنڈ کی رفتار سے اُڑے جا رہے تھے۔ اب شاید ہندوستانی رسم ورواج کا ذکر ہو رہا تھا۔ انہوں نے کڑک کر پوچھا۔ "کیا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بیچاری ہندوستانی دلھنیں کیا سوچتی ہوں گی؟" اور حاضرین کی طرف دیکھا۔

شیطان فوراً بولے۔ "جناب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مجھے ہندوستانی دلہن بننے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

اس کے بعد جب کبھی پروفیسر صاحب اس قسم کا سوال حاضرین سے پوچھتے شیطان فوراً اُٹھ کر اسی قسم کا جواب دے دیتے۔ خدا خدا کر کے لیکچر ختم ہوا اور صدر صاحب نے کہا۔ "اب روفی صاحب اسی موضوع پر تقریر کریں گے۔" سب لوگ تالیاں بجانے لگے۔ شیطان کی تقریر کا مجھے بالکل علم نہیں تھا، نہ میں نے ان کو تیاری کرتے دیکھا۔ شیطان مسکراتے ہوئے اسٹیج پر پہنچے اور بولے۔

"خواتین و حضرات! تقریر تو آپ سُن چکے ہیں اور اس حد تک محفوظ ہو چکے ہیں کہ اب کسی مزید تقریر کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کو ایک عجیب و غریب واقعہ سُناتا ہوں۔ کچھ عرصے کا ذکر ہے کہ میں رات کے وقت ریل میں سفر کر رہا تھا۔ میرے ساتھ ایک پراسرار سا شخص سفر کر رہا تھا۔ وہاں ہم دو ہی مسافر تھے۔ میری آنکھ لگ گئی۔ جب جاگا تو دیکھتا ہوں کہ وہ مسافر غائب ہے اور ساتھ

ہی میرا سامان بھی غائب ہے۔ فقط ایک چھوٹا سا ڈبّہ پڑا تھا جسے وہ بھول گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو یہی غنیمت ہے۔ دیکھنے میں وہ ایک معمولی سا ڈبّہ تھا اور باہر سے دیکھ کر کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کے اندر کیا ہو گا۔ اگلے روز ایک دوست کی سالگرہ تھی۔ میں نے وہی ڈبّہ تحفہ پیش کر دیا۔ اس شام کو میرے دوست نے مجھے علیحدہ بلا کر بہت بہت شکریہ ادا کیا اور کہا اس قدر قیمتی تحفہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے ڈبّہ واپس کرنا چاہا لیکن میں نے نہ لیا۔ اس نے اپنے کسی دوست کی سالگرہ پر وہی ڈبّہ پیش کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں دوستوں میں خوب لڑائی ہوئی اور ڈبّہ واپس آ گیا۔ میرے دوست نے اپنی منگیتر کی سالگرہ پر اسے دے دیا۔ اُن دونوں کی کھٹ پٹ ہو گئی تھی لیکن اس تحفے سے ساری رنجشیں دور ہو گئیں۔ میرے دوست کی منگیتر نے وہ ڈبّہ اپنی کسی سہیلی کی سالگرہ پر اسے دے دیا اور سہیلیاں آپس میں خوب لڑیں لیکن اس سہیلی نے ڈبّہ واپس نہ کیا بلکہ اپنے منگیتر کو دے دیا۔ منگیتر کچھ ناراض سا تھا۔ ڈبّہ ملتے ہی ساری ناراضگی جاتی رہی اور صلح ہو گئی۔ سو خواتین و حضرات! وہ ڈبّہ باری باری ایک دفعہ صلح کراتا تھا تو دوسری دفعہ جنگ!"

"اس ڈبّے کے اندر کیا تھا؟" ایک طرف سے آواز آئی۔

"ہاں! اس ڈبّے میں کیا تھا؟" کئی آوازیں آئیں۔

"پتہ نہیں کیا تھا۔ اس وقت بالکل یاد نہیں رہا۔" شیطان سر کھجاتے ہوئے بولے۔ سب کے سب شیطان کے پیچھے پڑ گئے کہ بتاؤ اس ڈبّے میں کیا تھا۔ اور شیطان معصوم شکل بنائے کھڑے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ بھول گیا۔ واپسی پر کئی حضرات نے ہمارا تعاقب کیا اور یہی سوال پوچھا۔

جب ہم کلب سے کافی دُور نکل آئے تو میں نے پوچھا۔ "مجھے تو بتا دو کہ اس ڈبّے میں کیا تھا؟"

"پتہ نہیں کیا تھا۔" وہ بولے۔ "یاد نہیں رہا۔"

چڑھائی چڑھتے چڑھتے شیطان دفعتہً ٹھہر گئے۔ ایک طرف اشارہ کر کے بولے۔ "یہ کوٹھی ہے اُن کی!"

"کِن کی؟"

"اب تمھیں کس طرح سمجھاؤں کِن کی۔" یہ کہہ کر شیطان نے ٹھنڈا سانس بھرا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

"خبردار کہیں تم عاشق تو نہیں ہو رہے ہو؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"ہو کیا رہا ہوں، ہو چکا۔ کبھی کا ہو چکا۔"

نہ مجھے عشق و محبّت سے خدا واسطے کا بیر ہے اور نہ عاشقوں سے دشمنی۔ لیکن ہر چیز موقعے پر اچھی لگتی ہے۔ یہ کیا کہ ہم تو پہاڑ پر سیر کرنے آئیں اور شیطان بجائے سیاحت کے عاشق ہونا شروع کر دیں اور میرے پروگرام کا ستیاناس کر کے رکھ دیں۔

"روفی! مجھے اس میدان میں خود تو تجربہ نہیں ہے لیکن میں نے اس مضمون پر بیشمار کتابیں پڑھی ہیں۔ میں نے ڈان جُو آن، کیزانووا، بائرن اور دیگر چمپئین عاشقوں کے متعلق بھی پڑھا ہے۔ لیکن تم ان سب کو مات کر گئے ہو۔ اس مہینے میں تم دس مرتبہ عاشق ہوئے ہو یا شاید گیارہ دفعہ۔ میرے خیال میں یہ ریکارڈ ہے!"

"لیکن اس مرتبہ میں اس بری طرح گھائل ہوا ہوں کہ کیا بتاؤں۔" شیطان دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر بولے۔ "اصلی اور حقیقی محبّت تو اس دفعہ ہوئی ہے۔ وہ اس کوٹھی میں رہتی ہے اور اتنی حسین ہیں کہ اگر تم دیکھ پاؤ تو خود عاشق ہو جاؤ۔"

"شکریہ! میں میدانوں کا باشندہ ہوں۔ مجھے پہاڑوں پر۔۔۔۔!"

"واہ! اگر کوہ ہمالیہ پر عشق نہ کیا تو پھر کہاں کریں گے!" شیطان بولے۔

"اب یہاں سے ہلو گئے بھی یا منجمد ہونے کا ارادہ ہے۔" میں سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔

"تم ہمیشہ رنگ میں بھنگ اور بھنگ میں رنگ ملا دیتے ہو، اچھا چلو۔ کل یہاں آئیں گے۔"

"ان لوگوں سے ملاقات ہوگئی کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہوگئی۔ اگلے مہینے جو کھیل کود ہو رہی ہے اس کے ٹکٹ فروخت کرنے گیا۔ وہیں ان کو دیکھا اور ان کے ابّا سے خوب باتیں ہوئیں۔ چلتے وقت انہوں نے کہا کہ کبھی پھر بھی آنا۔"

"کیسے ہیں؟"

"انہیں جانوروں، پرندوں اور شہد کی مکھیوں کا بے حد شوق ہے لیکن سب سے زیادہ شوق بھوتوں کا ہے۔ بھوتوں کے متعلق گفتگو کرنا ان کا محبوب ترین موضوع ہے۔ وہاں چند کتابیں بھی دیکھیں جن کے موضوع کچھ یوں تھے۔ 'بھوتوں کے افسانے'، 'ملفوظاتِ جن'، 'نئے بھوت'، 'چڑیلیں اور سماج'۔"

"تو اس مرتبہ کیا ارادہ ہے؟ یہ محبّت کتنے دن چلے گی؟"

"عمر بھر رہے گی۔" شیطان بولے۔ "اس مرتبہ میں واقعی سنجیدہ ہوں۔ اگر وہ لوگ مان گئے تو پھر۔"

"اچھا؟"

"ہاں!"

اپنے کمرے میں پہنچے۔ شیطان کی ڈاک رکھی تھی۔ ایک خط کھول کر عجیب سا مُنہ بنالیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

شیطان نے خط دکھایا۔ کسی خاتون نے ان کو لکھا تھا۔ "اگر تم نے میری چھوٹی بہن کو خط لکھنے بند نہ کئے تو میں تمہیں کچّا چبا جاؤں گی۔"

شیطان میری طرف دیکھنے لگے۔

"لعنت بھیجو، مت لکھا کرو اسے خط۔" میں نے مشورہ دیا۔

"لیکن کسے خط نہ لکھا کروں؟ کس کی چھوٹی بہن؟ لکھنے والی نے نہ تو اپنا نام لکھا ہے نہ اپنی چھوٹی بہن کا۔ اب میں اپنی ڈاک بند کرنے سے تو رہا۔"

دوسرا خط کھولا، وہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ایک خاتون نے ناراض ہو کر لکھا تھا۔ ”براہِ کرم میری تصویر واپس بھیج دیجئے اور آئندہ مجھے خط نہ لکھئے۔“

”بھیج دو اس کی تصویر۔“ میں نے کہا۔

”یوں نہیں، ذرا اچھی طرح بھیجیں گے۔“ وہ بولے۔

دو تین گھنٹے کی تلاش کے بعد میز پر بہت سی تصویریں اکٹھی ہو گئیں۔ لڑکیوں کے فوٹو، ایکٹرسوں کی تصویریں، اخباروں سے کاٹی ہوئی تصویریں۔ شیطان نے پچیس تیس تصویریں چُن کر ایک لفافے میں بند کیں اور لکھا۔ ”محترمہ! یقین فرمایئے کہ میں بالکل بھول گیا ہوں کہ آپ کی تصویر کیسی تھی؟ چنانچہ یہ تصویریں ارسال ہیں۔ ان میں سے آپ اپنی تصویر رکھ لیں اور باقی ماندہ تصویریں حفاظت سے واپس بھیج دیں۔“

جب شیطان کا کُنبہ پہاڑ پر آیا تو شیطان مجھے بھی ساتھ گھسیٹ لائے۔ کُنبہ کچھ عرصے کے بعد چلا گیا۔ لیکن ہم ٹھہر گئے۔ بہت بڑی کوٹھی تھی۔ میں نے مشورہ دیا کہ ایک دو کمرے ہم لے لیں باقی بند کر دیں۔ لیکن شیطان مُصِر تھے کہ پوری

کوٹھی استعمال کی جائے۔ چنانچہ ہم دو علیحدہ علیحدہ کمروں میں رہتے۔ ایک کمرہ سگریٹ نوشی کے لیے مخصوص تھا۔ ایک ناشتے کے لیے، ایک دوپہر کے کھانے کا، ایک سہ پہر کی چاء کا، ایک رات کے کھانے کا، مطالعہ کرنے کے لیے بھی ایک کمرہ تھا۔

جب شیطان شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں جانے لگے تو میں نے ایک مرتبہ پھر ان کو اس عشق و محبّت کے سلسلے میں ٹوکا۔ لیکن وہ ایک لمبا سانس لے کر بولے۔

"میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس خشک فضا اور کم ٹمپریچر کا اثر ہے۔ سطح سمندر سے سات آٹھ ہزار فٹ کی بلندی کا اثر ہے۔ اس لطیف ہوا کا اثر ہے۔ جس میں کثرت سے اوزون پائی جاتی ہے۔ یہ سارا کوہ ہمالیہ کا قصور ہے۔"

اگلے سہ پہر کو ہم دونوں نے اسی کوٹھی کا رُخ کیا۔ ہمارے ساتھ ہمارے پڑوسیوں کا لمبا چوڑا کتّا بھی تھا جسے شیطان کبھی کبھی سیر کرانے لے جایا کرتے تھے۔ ابھی ہم پھاٹک تک ہی پہنچے تھے کہ آواز آئی۔ "ذرا اپنے کتّے کو وہیں تھام کر رکھئے۔" پھر آواز آئی۔ "اپنے کتّے کو اتنی دیر تک پکڑے رکھئے، جتنی دیر تک خرگوش باغ میں نہ پہنچ جائیں۔"

ہم نے کتّے کو پکڑ لیا۔ آگے بڑھ کر دیکھتے ہیں کہ کوئی پچیس تیس خرگوش قطار باندھے باقاعدہ مارچ کرتے ہوئے باغیچے کی طرف جارہے ہیں۔ ایک طرف کوئی پچاس ساٹھ بلّیاں بالکل اٹنشن کھڑی ہیں۔ کچھ چوہوں کی قسم کے جانور اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔

ہم اندر پہنچے۔ ایک بزرگ بیٹھے بلّیوں کا راشن تقسیم کر رہے تھے۔ چند طوطے ان کے کندھوں پر بیٹھے شور مچا رہے تھے۔ دو تین مور ایک طرف مؤدبانہ کھڑے اپنی باری کے منتظر تھے۔ ہمارا تعارف ایک صاحب سے کرایا گیا جو کچھ دیر شیطان کو بغور دیکھتے رہے پھر بولے۔ "میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔"

"آپ کا خیال صحیح ہے۔ ضرور دیکھا ہو گا۔ میں اکثر وہاں جایا کرتا ہوں۔"

چاء پر ہمیں شہد لگے ہوئے ٹوسٹ ملے۔ شیطان کے ٹوسٹ پر بالکل ذرا سا شہد لگا ہوا تھا۔

اُنہوں نے پہلے ٹوسٹ کا بغور ملاحظہ فرمایا پھر بزرگ بولے۔ "یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے ایک شہد کی مکھّی بھی پال رکھی ہے۔"

"ایک شہد کی مکھّی؟"

"جی ہاں ایک! جس کا یہ شہد ہے۔"

فوراً شیطان کے سامنے شہد کا مرتبان رکھ دیا گیا۔

ہمیں خرگوش کے نام بتائے گئے۔ ہر ایک خرگوش کا الگ الگ نام تھا۔ ایک بلّی دکھائی گئی جس کی کبوتروں سے بڑی گہری دوستی تھی۔ وہ کبوتروں کی رکھوالی کرتی تھی۔

شیطان نے موقع پا کر بھوتوں کا ذکر شروع کر دیا۔ بھوتوں کی قسمیں، اُن کے رسم و رواج، ان کی معاشرت، بھوتوں کا مالی نظام، غرضیکہ بھوتیات پر خوب بحث ہوئی۔

"کیوں قبلہ! بھوت کتنی بلندی تک پایا جاتا ہے؟" شیطان نے پوچھا۔

"نو دس ہزار فٹ تک تو میں نے خود بھوت دیکھے ہیں۔ دارجیلنگ کی ٹائیگر ہل پر۔" وہ بولے۔

"سُنا ہے کہ لوگوں نے کنچن چنگا اور ماؤنٹ ایورسٹ پر بھی بھوت دیکھے ہیں۔" شیطان نے کہا۔

"برخوردار! معلوم ہوتا ہے کہ تم بھوتوں میں نہ صرف دلچسپی لیتے ہو بلکہ تم نے ان کا کافی مطالعہ بھی کیا ہے۔" ان کی باچھیں کھِل گئیں۔

"کچھ نہ پوچھئے، میں تو بھوتوں پر عاشق ہوں۔ محض ان کے لیے زندہ ہوں۔ میں نے ہندوستان کے ہر حصّے کے بھوت دیکھے ہیں۔ یہاں بھی کل رات چند بھوتوں سے واسطہ پڑا!"

"اچھا؟ تو یہاں بھی بھوت ہیں؟" بزرگ چہک کر بولے۔

"بھوت کہاں نہیں ہیں؟" شیطان نے مُسکرا کر کہا۔

شام ہو چلی تھی۔ اصرار کیا گیا کہ ہم کھانا یہیں کھائیں۔ بھلا شیطان کو کیا عذر ہو سکتا تھا۔ ہمارا تعارف بچّوں سے ہوا۔ بچّے سکول کا کام کر رہے تھے۔ ایک بچّی نے شیطان سے پوچھا۔ "بھائی جان شُترمرغ کیا ہوتا ہے؟"

"ڈکشنری میں ڈھونڈو ننھی۔" شیطان بولے۔

اتنے میں ننّھے میاں ایک کاپی لائے اور بولے۔ "میں نے ابّا جان کو خط لکھا ہے۔ دیکھئے صحیح ہے نا؟"

شیطان نے بغور مطالعہ کیا اور بولے۔ "باقی سب صحیح ہے صرف شروع کا ایک فقرہ بدل دو جہاں تم نے لکھا ہے۔۔۔ بعد آدابِ فرزندانہ بجا کر عرض ہے۔۔۔ اس کی جگہ لکھو۔۔۔ ڈھول بجا کر عرض ہے۔"

"کہاں آ پھنسے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "چلو یہاں سے۔"

دوسرے کمرے میں پہنچے۔ وہاں بالکل اندھیرا تھا۔ بجلی کے سوِچ وغیرہ کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ ناچار اندھیرے میں ہی بیٹھے رہے۔ برآمدے سے بزرگ نے کچھ کہا۔ غالباً وہ شیطان سے کتّے کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔ شیطان چپ رہے۔ انہوں نے پھر پوچھا۔ یہ بدستور چپ رہے۔ جب انہوں نے تیسری بار پوچھا تو شیطان بولے۔ "معاف کیجئے قبلہ! یہاں اس قدر اندھیرا ہے کہ میں کچھ نہیں سُن سکتا۔"

اور کمرہ فوراً روشن کیا گیا۔ کھانے پر ہم بقیہ خواتین و حضرات سے ملے۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو شیطان کا مارے خوشی کے بُرا حال تھا۔

چیڑ کے درختوں سے چاند طلوع ہو رہا تھا۔ شیطان کچھ دیر چاند کو دیکھتے رہے۔ پھر لمبا سانس لے کر بولے۔ "آہ چاندنی، محبّت، موسیقی اور کوہ ہمالیہ۔"

"یہ کوہ ہمالیہ کو تم ہر بار کیوں گھسیٹ لیتے ہو؟" میں نے چِڑ کر پوچھا۔

"تمہارا تجربہ محدود ہے لہٰذا خیالات بھی محدود ہیں۔" شیطان نے جواب دیا۔

ایک شام کو شیطان نے بتایا کہ کل صبح وہ لوگ پکنک پر جا رہے ہیں۔ اور ہمیں بھی مدعو کیا گیا ہے۔ علی الصبح ہم ان کے ہاں پہنچے۔ وہ سب تیار تھے۔ باغیچے میں موٹر کھڑی تھی۔

"کسی کو موٹر چلانی آتی ہے؟" بیگم نے پوچھا۔

"ہاں مجھے آتی ہے۔" شیطان نے ہاتھ کھڑا کر کے جواب دیا۔ میں متعجّب تھا کیونکہ شیطان کو موٹر کیا اچھی طرح بیل گاڑی بھی چلانی نہیں آتی تھی۔

"تو آج تم چلاؤ۔ ڈرائیور بازار گیا تھا، وہیں رہ گیا۔"

اب شیطان سٹپٹائے بولے۔ "مجھے اچھی طرح چلانی نہیں آتی۔ بس یونہی معمولی سی آتی ہے۔"

"بازار تک بالکل سیدھا راستہ ہے۔ وہاں تک لے چلو۔ وہیں ڈرائیور بھی مل جائے گا۔"

”بات یہ ہے کہ میں نے تھوڑی سیکھی ہے۔ بالکل معمولی سی آتی ہے۔“

”کوئی مضائقہ نہیں۔ آؤ۔“

شیطان آگے بڑھے۔ موٹر کو اِدھر اُدھر سے سونگھا پھر مُسکرا کر بولے۔ ”جی بات دراصل یہ ہے کہ مجھے ابھی تک صرف ہینڈل گھمانا سکھایا گیا ہے۔ باقی چیزیں بھی بہت جلد سیکھ لوں گا۔“

شیطان میں اور ننھّا تینوں ڈرائیور کی تلاش میں نکلے۔ ایک دکان دیکھ کر شیطان کو چاکلیٹ خریدنے یاد آ گئے۔ دکان پر نوٹس لگا ہوا تھا۔ ”کتّوں کو اندر لانے کی اجازت نہیں ہے۔“ شیطان ننّھے سے بولے۔ ”اچھا بھئی نے تم ذرا باہر ٹھہرو ہم ابھی واپس آتے ہیں۔“ اور ننھّا مچل گیا۔ بڑی مشکلوں سے چپ کرایا اور ڈرائیور کی تلاش شروع ہوئی۔

واپس پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ وہ لوگ پہاڑی راستے سے چلے گئے ہیں۔ کار لے کر چلے، آٹھ دس میل کا راستہ تھا۔ ہم نہایت ہی پُر فضا مقام پر پہنچ گئے۔ وہاں چند جھیلیں بھی تھیں۔ بزرگ کو مچھلیاں پکڑنے کا بے حد شوق تھا۔ وہ جملہ ساز و سامان ساتھ لائے تھے۔ شیطان کو غالباً مچھلیاں پکڑنے سے کوئی خاص دلچسپی نہ

تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انسان پوست یا بھنگ کا ایک پیالہ چڑھا کر کسی تالاب کے کنارے مچھلیاں پکڑنے بیٹھ جائے تو دن اچھی طرح گزر سکتا ہے۔

لیکن چونکہ بزرگ اس قدر مشتاق تھے اس لیے شیطان کو بھی شریک ہونا پڑا۔ ہم سب کانٹے پانی میں پھینک کر بیٹھ گئے جو بولتا شیطان ایک لمبی سی ہشت سے اسے چُپ کرا دیتے۔

تھوڑی دیر بعد جمائیاں آنی شروع ہو گئیں۔ شیطان گھاس پر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ "تم سو جاؤ۔" میں نے ازراہِ ہمدردی کہا۔ "جب کوئی مچھلی پھنسے گی، میں تمہیں جگا دوں گا۔"

"تو گویا آپ کو یہ بھی امید ہے۔ میں نے خاص طور پر ایسا تالاب چُنا ہے جس میں مچھلی تو ایک طرف مینڈک بھی نہیں ملے گا۔"

"تو پھر مچھلیاں پکڑنے بیٹھے کیوں تھے؟" بزرگ نے پوچھا۔

"یونہی ذرا استانے کے لیے۔" یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

ذرا سی دیر میں شیطان کی ڈور ہلنے لگی۔ "روفی!" میں چلّایا۔ "ڈور ہل رہی ہے!"

وہ بیزار ہو کر اُٹھے اور انگڑائی لے کر بولے۔ ”تم چین سے سونے نہیں دو گے اور اِدھر یہ مچھلیاں، معلوم ہوتا ہے میں نے غلط تالاب چُنا ہے۔“

محبوبۂ شیطان خوب ہنس رہی تھیں۔ شیطان کی ایک ایک بات پر وہ کھِلکھلا پڑتیں۔ لیکن نہ جانے مجھے وہ کیوں ناپسند تھیں۔

ہم سب اسٹرابری توڑنے نکلے۔

اتنے میں ہم نے دیکھا کہ محبوبۂ شیطان اکیلی جارہی ہیں۔ شیطان مجھے چھوڑ کر اُن کی طرف لپکے۔ میں نے جتنی اسٹرابری توڑیں سب کھالیں۔ پانچ چھ دانے ہاتھ میں لے کر واپس لوٹا۔ گراموفون بج رہا تھا اور کھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اتنے میں شیطان اور محبوبۂ شیطان آ پہنچے۔ شیطان نے بتایا۔ ”آج میں اس قدر پیدل چلا ہوں اور اتنا تھک گیا ہوں کہ بعض اوقات مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ محض حافظے کے زور سے چل رہا ہوں۔“ اور انہوں نے کوئی تین چار سیر اسٹرابری گھاس پر اُلٹ دیں۔ ”ارے!“ سب چونک کر بولے۔ ”اتنی ساری کیونکر توڑلیں؟“

اور ریکارڈ بج رہا تھا۔ ”آج ہمالہ کی چوٹی سے ہم نے پھر للکارا ہے۔ دور ہٹو اے دنیا والو ہندوستان ہمارا ہے۔“ شیطان بولے۔ ”یہ سُنا آپ نے؟ گانے والا ہمالیہ کی

کسی چوٹی پر چڑھ چکا ہے۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ کون سی چوٹی تھی؟ کنچن چنگا، ماؤنٹ ایورسٹ یا کوئی اور؟ جن چوٹیوں پر بڑے بڑے سیّاح نہ چڑھ سکے، ہمارا گویّا جا چڑھا۔ لیکن ایسی تنہا جگہ سے للکارنے کا کیا فائدہ؟"

بزرگ اسٹرابری کھا رہے تھے۔ بُرا سا مُنہ بنا کر بولے۔ "برخوردار، یہ تو باسی معلوم ہوتی ہیں۔" اور شیطان فوراً مان گئے کہ وہ مول لائے ہیں۔

شام کو واپس ہوئے تو بزرگ موٹر چلا رہے تھے۔ راستے میں ہم نے دیکھا کہ دو آدمی تار کے کھمبے پر چڑھ رہے ہیں۔ غالباً مرمت کے سلسلے میں۔

شیطان بزرگ سے بولے۔ "یہ دیکھا آپ نے؟ یہ بیوقوف خواہ مخواہ ڈر رہے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ آج آپ پہلی مرتبہ موٹر چلا رہے ہیں۔"

"موٹر خوب تیز چل رہی ہے۔" کسی نے کہا۔

"تیز کیوں نہ ہو، گھر کی طرف جو جا رہی ہے۔" شیطان بولے۔

"آج کی سیر کیسی رہی؟" کسی نے شیطان سے پوچھا۔

"آج میں اتنے اچھے اچھے نظارے یکلخت دیکھ گیا ہوں کہ اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ وقت ملنے پر جگالی کر کے بتاؤں گا۔" شیطان نے جواب دیا اور بزرگ اتنے زور سے ہنسے کہ موٹر ایک کھمبے سے ٹکراتے بچی۔

اگلے روز ہم نچلی سڑک پر کھڑے سوچ رہے تھے کہ آج کیا کریں۔ اتنے میں ایک شخص راہ چلتے چلتے ٹھہر گیا اور پوچھنے لگا۔ "کیوں جناب! روفی صاحب کہاں رہتے ہیں۔"

روفی نے دو فرلانگ دُور اپنی کوٹھی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ "وہاں رہتے ہیں۔ اُس کوٹھی میں۔"

سڑک سے کوٹھی کو ایک عمودی راستہ جاتا تھا۔ بڑی سخت چڑھائی تھی۔

وہ شخص چڑھائی چڑھنے لگا اور نظروں سے غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں ہانپتا ہوا واپس آیا اور روفی کو قہر بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔

"بھئی خواہ مخواہ اسے ناراض کر دیا۔ کہیں یہ کوچۂ یار سے نہ آیا ہو۔" میں نے کہا۔

"ارے!" وہ چونک کر بولے۔ "پہلے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ ممکن ہے کوئی پیغام ہی لایا ہو۔"

"شاید اُن بزرگ نے کسی اہم معاملے پر گفتگو کرنے کے لیے بلایا ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اُن کو کیا پتہ؟" شیطان نے پوچھا۔

"تو تمہارے خیال میں کسی کو پتہ ہی نہیں۔ گھر کا گھر جانتا ہے۔ یہاں تک کہ وہاں کا مریل سا کتّا بھی تمہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اسے بھی شُبہ ہے۔ اگر تمہاری امّی کو پتہ چل گیا تو مصیبت آ جائے گی۔"

"بے شک آ جائے۔ عرصے سے مصیبت نہیں آئی۔" شیطان انگلیوں پر گِن کر بولے۔ "چار ماہ گزر گئے ہیں کوئی مصیبت نہیں آئی۔"

"تو چلو پھر کوئے یار کی طرف چلیں۔ اگر کچھ ہوا تو معلوم ہو جائے گا۔ لیکن یہ بلّیاں، چوہے، خرگوش، یہ سب الا بلا مجھے سخت ناپسند ہے۔ تم کہنا تو سہی کبھی اُن سے۔"

"مجھے خود ناپسند ہیں۔ میں آج پھر ان بزرگ کو ڈانٹوں گا۔"

"پھر ڈانٹوں گا!۔۔۔ کیا مطلب؟ کیا پہلے بھی کبھی ڈانٹا تھا؟"

"ہاں کل بھی میرا ارادہ ہوا تھا کہ انہیں ڈانٹوں۔۔۔۔"

ہم سیدھے محبوبۂ شیطان کے ہاں پہنچے۔ بزرگ باغیچے میں کام کر رہے تھے۔ ہمیں دفعتاً معلوم ہوا کہ ان کو پودوں وغیرہ کا بھی خبط ہے۔

"مبارک ہو۔" میں نے شیطان سے کہا۔

بزرگ نے ہمیں اپنا ذخیرہ دکھایا جہاں پر بمشکل دس بارہ پودے ہوں گے۔ شیطان نے باغیچے سے پودے اُکھاڑ اُکھاڑ کر واپس ذخیرے میں لگانے شروع کر دیئے۔ میں نے ٹوکا تو بولے۔ "ذخیرے کی عزّت رکھ رہا ہوں، یہاں کچھ تو رونق ہونی چاہیے۔"

چلتے وقت شیطان نے ایک بُرش اٹھا کر بزرگ کو دکھایا۔ بُرش کے آدھے بال سیاہ تھے، آدھے سفید۔ کہیں کہیں سے جھڑ بھی گئے تھے۔ بولے "قبلہ! یہ بُرش بوڑھا ہوتا جا رہا ہے۔ کچھ کچھ گنجا بھی ہو چلا ہے۔"

راستے میں شیطان نے میرے کان میں کہا۔ "آج شام کو سینما میں بلایا ہے۔ وہ پہلے شو میں آئیں گے۔ ضرور چلیں گے۔"

"تم اکیلے ہی جانا، بھلا میں کیا کروں گا؟" میں نے بیزار ہو کر کہا۔

"تم ضرور چلو گے۔"

سہ پہر سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ کہنے لگے۔ آج سیاہ ڈِنر سوٹ پہنوں گا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا ڈنر پر جا رہے ہو؟"

بولے۔ "کچھ بھی کہو آج ضرور سیاہ سوٹ پہنوں گا اور سیاہ بو بھی لگاؤں گا۔"

سوٹ پر استری کی گئی۔ سیاہ جرابیں فوراً بازار سے خریدی گئیں۔ سیاہ جوتے پر نوکر دوپہر سے پالش کر رہا تھا۔

جب شیطان سوٹ پہننے لگے تو سینما میں کل پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں بالکل تیار تھا کہ یکایک شیطان نے ایک دلدوز چیخ ماری۔ "سیاہ بو کہاں گئی؟"

"تم نے نکالی بھی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں نکالی تھی، بستر پر رکھی تھی۔"

اب سیاہ بو کی تلاش شروع ہوئی۔ ذرا سی دیر میں بستر قالین پر پڑا تھا اور قالین پلنگ پر۔ میں اور شیطان پلنگ کے نیچے گھسے ہوئے دیا سلائی جلا جلا کر سیاہ بو ڈھونڈ رہے تھے۔ شیطان نے بے خبری میں اٹھنا چاہا تو دھڑام سے پٹّی سر میں لگی۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کے لیے اسپرین تلاش کر کے دی۔

"ٹائی لگالو یا کوئی اور بو سہی۔"

"غضب خدا کا۔ سیاہ سوٹ پر سیاہ بو نہ ہو۔ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ تہمد باندھ لیا جائے۔"

ہم پھر تلاش میں مصروف ہو گئے۔ یہاں تک کہ کمرے کی ایک ایک چیز برآمدے میں پہنچ گئی۔ اب صندوقوں کی باری آئی۔ سینما کا وقت کبھی کا ہو چکا تھا۔ لیکن شیطان بار بار یہی کہتے تھے۔ کہ خبریں ہو رہی ہوں گی۔ کارٹون ہو رہا ہو گا۔

"اچھا بازار سے ہو کر چلتے ہیں، راستے میں خرید لیں گے۔" میں نے مشورہ دیا۔

"ہرگز نہیں۔" شیطان مچل گئے۔

"ارے یہ کیا لٹک رہی ہے تمہاری جیب سے۔"

جب ہم تیار ہو کر باہر نکلنے لگے تو یوں معلوم تھا جیسے کوٹھی میں ابھی ابھی چوری ہوئی ہے اور چوروں نے خوب فرصت میں بیٹھ کر اپنی اپنی پسند کی چیزیں چرائی ہیں۔ بھاگم بھاگ سینما پہنچے۔ انٹرول ہونے والا تھا۔ اندر پہنچ کر شیطان محبوبۂ شیطان کو تلاش کرنے لگے۔ لیکن اندھیرے میں کچھ پتہ نہ چلا۔ ناچار دروازے کے پاس بیٹھ گئے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خاتون گھبرائی ہوئی آئیں اور اِدھر اُدھر جگہ تلاش کرنے لگیں۔ گیٹ کیپر نے ان کو شیطان کے برابر والی سیٹ پر بٹھا دیا۔

"بھئی یہ تو ہمیں بھی مات کر گئیں۔" شیطان بولے۔ ہم دونوں نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ محبوبۂ شیطان نہیں تھیں۔ کوئی اور تھیں۔

اب سینما چھوڑ چھاڑ کر شیطان انہیں کو دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولے۔ "آپ میرے دستانوں پر بیٹھ گئی ہیں۔" وہ اٹھنے لگیں۔ "نہ نہ اُٹھئے مت، تکلیف نہ کیجئے۔ میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔"

انہوں نے دستانے شیطان کو دے دیئے۔ شیطان بولے۔ "آپ کے ہاتھ برف سے بھی ٹھنڈے ہیں۔ آپ یہ دستانے پہن لیجئے ورنہ سردی لگ جانے کا اندیشہ ہے۔"

"جی نہیں! شکریہ!" وہ بولیں۔

انہوں نے اپنے دستی بیگ سے کچھ نکالا اور آہستہ آہستہ کھانے لگیں۔

"یہ اکیلے اکیلے ہی۔" شیطان نے کہا۔

پہلے تو وہ شرمائیں، پھر ایک چاکلیٹ کا ٹکڑا روفی کے ہاتھ میں دے دیا۔

"میرے ساتھ یہ بھی ہیں، ان کا حصّہ ؟"

انہوں نے ایک ٹکڑا اور دے دیا۔ شیطان دونوں مُنہ میں رکھ کر بولے۔ "نہایت لذیذ چاکلیٹ ہیں۔ آپ نے کس دکان سے لیے تھے ؟"

وہ خاموش رہیں۔ جب شیطان نے دو چار اسی قسم کے سوال اور پوچھے تو اُٹھ کر اگلی قطار میں جا بیٹھیں۔ شیطان بھی اُٹھے اور میں ان کے پیچھے جا بیٹھے۔ حالانکہ اِدھر اُدھر کافی سیٹیں خالی تھیں۔

شیطان آگے جھک کر بولے۔ "اگر تکلیف نہ ہو تو ذرا کوٹ کا کالر نیچے کر لیجئے۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا سوائے آپ کے۔ شکریہ اور پلّو بھی۔"

انہوں نے شیطان کی فرمائش کی تعمیل کر دی۔

"اور اگر آپ ایک سیکنڈ کے لیے اپنا رومال عنایت فرمادیں تو میں عینک کے شیشے صاف کرلوں۔ یقین کیجئے واپس ضرور دے دوں گا۔"

انہوں نے مُسکرا کر رومال دے دیا اور شیطان کوئی آدھ گھنٹے تک عینک کے شیشے صاف کرتے رہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے شیشے کھرچ رہے ہوں۔

رومال واپس ملتے ہی وہ ایک اور سیٹ پر جا بیٹھیں۔ شیطان نے پھر تعاقب کیا۔ آخر تنگ آکر وہ دروازے کے پاس کنارے کی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ شیطان فوراً ان کے پیچھے آ بیٹھے اور بولے۔ "اب مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ باہر نہ چلی جائیں۔"

اور وہ مُسکرادیں۔ نہ صرف مُسکرادیں بلکہ باقاعدہ ہنس دیں۔

انٹرول میں شیطان نے ان سے باتیں بھی کیں۔

اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ شیطان جیسا ہونّق شخص بطور عاشق کے اس قدر کامیاب کیونکر رہتا ہے۔ چھوٹا سا چہرہ، لمبی گردن، کوئی سات فٹ لمبا قد، کھجور کی طرح دبلے ہونٹوں پر وہ مکّار سی مسکراہٹ، ناک پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک جس کے بغیر وہ اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اپنی اپنی ہمّت ہے۔

جب ہم سینما سے واپس آ رہے تھے تو شیطان نے غمگین آواز میں کہا۔ ''آج وہ چوٹ کھائی ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ کس طرح کہوں کہ۔۔۔۔یعنی''

''یونہی آج پھر عاشق ہو گئے ہو۔''

''ہاں عاشق ہی نہیں، بس سمجھ لو کہ فریفتہ ہو گیا ہوں۔ فدا ہو گیا ہوں۔ مَر مِٹا ہوں۔''

''اور وہ جو چند گھنٹے پہلے ان موٹی تازی خاتون پر عاشق تھے وہ؟''

''وہ محبّت تھوڑا ہی تھی۔ وہ تو سودائے خام تھا۔ بلکہ خیالِ خام تھا۔ اس مرتبہ تو میں سچ مُچ۔۔۔ بھئی تم یوں میری دل شکنی مت کیا کرو ورنہ میں رو پڑوں گا۔''

''رو پڑو۔ آج یہ حسرت بھی نکل جائے۔ آج تک میں نے کبھی تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

''اب رونا ہی رونا ہے زندگی میں۔ بہت ہنس چکے۔'' شیطان بسور کر بولے۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔

''کون ہیں یہ؟'' میں نے پوچھا اور شیطان نے ان کا سارا شجرۂ نسب بتا دیا۔

"یہ اپنے ابّا کے ساتھ ہر روز کلب جاتی ہیں۔ اب ہم بھی کل سے روز کلب چلا کریں گے۔"

شیطان مُنہ اٹھا اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ غالباً انہیں چاند کی تلاش تھی۔

"چاند آج نہیں نکلے گا۔ آج تاروں کو دیکھ کر ہی صبر کر لو۔ میں کلب اس شرط پر چلوں گا کہ تم قسم کھاؤ کہ پھر عاشق نہیں ہو گے۔"

"اب میں کہاں عاشق ہو سکتا ہوں۔ مجھ میں دوبارہ عاشق ہونے کی تاب ہی کہاں ہے۔ اب تو قسمت نے فیصلہ کر دیا ہے۔ زندگی کی منزل قریب آ پہنچی۔ آہ تارے، محبّت اور کوہ ہمالیہ۔"

یہ کہہ کر انہوں نے اُونٹ کی طرح زور زور سے سانس لے۔ "واقعی کوہ ہمالیہ کا قصور ہے۔" میں نے کہا۔ "بیچارہ کوہ ہمالیہ۔"

چار بجے کلب پہنچے۔ وہ خاتون بلّا لیے ٹینس کورٹ میں کھڑی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر مُسکرائیں اور شیطان نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "آپ کھیل چکیں کیا؟"

"کھیلتی کیونکر؟ کوئی اور کھلاڑی تو تھا ہی نہیں اکیلی تھی۔"

"میں سمجھا شاید سنگلز کھیل رہی تھیں۔"

میں نے ان کو غور سے دیکھا اور شیطان کے مذاق پر دل ہی دل میں لعنت بھیجی۔ آخر کس حکیم نے مشورہ دیا ہے کہ جسے دیکھ پاؤ فوراً اس پر عاشق ہو جاؤ۔

اتنے میں اُن کے ابّا آ گئے۔ یہ وہی حضرت نکلے جن کو ہم سقراط کہا کرتے تھے۔ انکی بے حد ثقیل اور عالمانہ گفتگو کی وجہ سے۔ ہمیں وہ واجبی طور پر جانتے تھے۔

شیطان میرے کان میں بولے۔ "یہ ٹینس کے عاشق ہیں۔ اب ان سے دوستی کرانا تمہارا فرض ہے۔" چنانچہ میں نے سقراط صاحب کے ساتھ بے تحاشا ٹینس کھیلی اور شیطان اور وہ خوب دوست بن گئے۔

ہم سب ہال کمرے میں بیٹھے تھے۔ سقراط صاحب نوکروں کی شکایت کر رہے تھے۔ نوکروں نے ان کا ٹانگہ بالکل ہی توڑ دیا تھا۔ پہاڑ پر یہ ٹانگہ بھی ایک عجوبہ تھا۔

"اور کمبختوں نے یہ کیا کہ ٹانگہ کہیں باہر نہیں گیا۔ بس کھڑا کھڑا ایکلخت ٹوٹ گیا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑا۔ بتایئے ہیں کیونکہ مان لوں؟"

"ممکن ہے کہ ٹانگے کا ہارٹ فیل ہو گیا ہو۔" شیطان نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

انہوں نے شیطان کو سگریٹ پیش کیا۔ شیطان نے پہلے تو انکار کیا لیکن اصرار کرنے پر سلگائی اور یوں ظاہر کیا جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ یہ گناہِ کبیرہ کر رہے ہوں (ویسے ہر روز شیطان ڈیڑھ دو سیر تمبا کو سگرٹوں کی صورت میں پھونک ڈالتے تھے)۔

ابھی دو چار ہی کش لگائے ہوں گے کہ چہرہ پریشان سا بنالیا۔ دیدے مٹکانے لگے اور گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"کیا ہوا؟" سقراط صاحب نے پوچھا۔

"غضب ہو گیا۔ سگریٹ چڑھ گئی۔" شیطان بولے۔ "چکر آرہے ہیں۔"

"تو تم واقعی سگریٹ نہیں پیتے؟"

"جی نہیں!"

اچھا تو یہ بات تھی۔ سقراط صاحب پر رعب ڈالنا چاہتے تھے۔ شیطان کو پانی پلایا گیا۔ خوشبو سنگھائی گئی۔ اتنے میں ابنِ بطوطہ صاحب (جو حکمت کا بھی شوق کرتے تھے) چند خوبانیاں اٹھا لائے اور شیطان سے کہا۔ "انہیں نوش فرمایئے۔ ان سے قلب کو فرحت پہنچے گی اور روح پر طراوت آئے گی۔ طبیعت میں مسرت پیدا ہو گی۔"

شیطان خوبانیاں کھاکر ہوش میں آئے اور بولے۔ ”خوبانی نہ صرف قلب وروح کو فرحت پہنچاتی ہے۔ بلکہ جوڑوں کو قوّت اور گردوں کو ہمّت اور تِلی کو طراوت بخشتی ہے۔ جگر کا ورم رفع کرتی ہے۔ پھیپھڑوں کو حرارت عطا کرتی ہے۔ جسم میں صالح اور تازہ خون پیدا کرتی ہے۔ یرقان کے لیے اکسیر ہے۔ ضعفِ بصارت کے لیے تیر بہدف کا کام دیتی ہے۔ نزلہ زکام میں معجزے سے کم نہیں۔“

آخر محبوبۂ شیطان نے شیطان کی دعوت منظور کر لی اور سہ پہر کو چاء پر آنے کا وعدہ فرمایا۔

کافی انتظار کے بعد سائیکل کی گھنٹی کی آواز ہمارے کانوں میں آئی۔ ہم باہر گئے۔ دیکھا تو سائیکل ایک طرف رکھے کھڑی ہیں، جیسے جھجک رہی ہوں۔

”اندر تشریف لے آیئے۔“ شیطان بولے۔ ”آپ کی سائیکل محفوظ رہے گی۔ لیمپ اور پمپ بھی کوئی نہیں چُرائے گا۔“

میں نے ان کے لباس کے مذاق اور بناؤ سنگھار کو دیکھ کر لا حول پڑھی۔ اِدھر شیطان تھے کہ بچھے جا رہے تھے۔ بالکل "وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے" والی حرکتیں کر رہے تھے۔

باتوں باتوں میں نہ جانے تاریخ کا موضوع کہاں سے آ گیا۔ دیر تک بادشاہوں، جنگوں اور پالیسیوں پر بحث ہوتی رہی۔ وہ بولیں "مجھے دو شخص بہت پسند ہیں۔"

"دوسرا کون ہے؟" شیطان نے پوچھا اور وہ شرما کر رہ گئیں۔

انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ کلکتہ میں ایک عرصہ تک رہی ہیں۔ اب شیطان نے جو کلکتہ کی تعریفیں شروع کی ہیں تو میں تنگ آ گیا۔ جس چیز کا ذکر آتا شیطان فوراً کہتے کہ کلکتہ میں یہ کہیں بہتر ہے۔ کلکتہ میں یہ کہیں اچھا ہوتا ہے۔

پہاڑی نظاروں کا ذکر ہوا تو شیطان بولے کہ کلکتہ کے گرد و نواح میں اس سے کہیں بہتر نظارے ملتے ہیں۔ خشکی کا ذکر ہوا تو شیطان نے اس انداز سے کلکتہ کا ذکر کیا جیسے بارہ مہینے وہاں برف پڑتی ہو۔

"یہاں چاند کتنا بڑا اور چمکدار نکلتا ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن کلکتہ کا چاند۔۔۔ کلکتہ میں اس سے کہیں بڑا اور چمکدار چاند نکلتا ہے۔"

جب شام کو وہ چلنے لگیں تو خدا حافظ کہہ کر شیطان بولے۔ ”دیکھئے اگر گھر پہنچ کر آپ کا دستی بیگ نہ ملے تو یہ یاد رکھئے کہ آپ اسے یہاں نہیں لائی تھیں۔“

اتوار کو سپورٹس ہوئے۔ شیطان انتظامی کمیٹی میں تھے اس لیے کے انہوں نے بہت سے ٹکٹ فروخت کئے تھے۔ بہت بڑا مجمع تھا اور خوب رونق تھی۔ ایک صاحب بھاگے بھاگے آئے اور شیطان سے پوچھنے لگے۔ ”آپ ہاکی کھیلیں گے؟“

”جی نہیں!“

”آپ نے وعدہ تو کیا تھا۔“

”درست ہے، لیکن اس وقت جی نہیں چاہ رہا۔“ اور پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔ ”کس قدر بے معنی کھیل ہے۔ کوئی یقین کر سکتا ہے کہ بائیس صحیح الدّماغ حضرات کی چھوٹی سی گیند کے لیے پاگلوں کی طرح بھاگ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے ٹخنے توڑ رہے ہیں۔ توبہ توبہ!“

ہاکی کے بعد گھوڑوں کی دوڑ شروع ہوئی جس میں گھوڑوں کو چھلانگیں بھی لگانی پڑتی تھیں۔ شیطان کو بھی پکڑ لیا گیا۔ پہلے تو ایک سخت کٹکھنی قسم کا گھوڑا شیطان

کو دیا گیا جس کو دیکھتے ہی ان کے دیوتا کوچ کر گئے اور انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ گھوڑے کے پاس بھی نہ پھٹکیں گے۔

ابنِ بطوطہ بولے۔ ”روفی صاحب! بزدل مت بنئے۔“

”صاحب یہاں جان کا خطرہ ہے اور تھوڑی دیر کی بزدلی عمر بھر کی موت سے کہیں بہتر ہے۔“

طے یہ ہوا کہ کوئی اور گھوڑا لایا جائے۔ آخر ایک گھوڑا لایا گیا۔ جو بچھیرا زیادہ تھا اور گھوڑا کم۔ شیطان بولے۔ ”میں بچپن سے سواری کا دلدادہ ہوں لیکن آج تک کوئی گھوڑا رضامند نہیں ہوا۔“

”یہ گھوڑا رضامند ہے۔“ آوازیں آئیں۔

”لیکن میں نے آج تک کبھی سواری نہیں کی۔ آج پہلا اتفاق ہے۔“

”یہ بھی نو عمر بچھیرا ہے۔ اس پر بھی آج تک کوئی سوار نہیں ہوا۔ اس کا بھی آج پہلا اتفاق ہے۔“

”لیکن یہ بہت چھوٹا ہے۔“ شیطان بولے۔

کسی نے ایک نہ سُنی اور شیطان کو زبردستی گھوڑے پر بیٹھا دیا گیا۔ ان کے دونوں پاؤں زمین کو چھُو رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے شیطان گدھے پر بیٹھے ہوں۔

دوڑ شروع ہوئی۔ دیکھنے والوں کو یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے شیطان کا گھوڑا نہیں دوڑ رہا بلکہ وہ خود دوڑ رہے ہیں۔ ایک جگہ جو کود پھاند ہوئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ شیطان ایک دم رُک گئے۔ وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ غور جو کیا تو معلوم ہوا کہ شیطان قدم جمائے زمین پر کھڑے ہیں اور گھوڑا نیچے سے نکل گیا ہے۔ شیطان فاتحانہ انداز میں مجمع کی طرف لوٹے۔ لوگوں کا مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ کسی نے بتایا کہ ایک لڑکی ہنستے ہنستے بے ہوش ہو گئی ہے۔ شیطان فوراً اس طرف بھاگے۔ جب آدھ گھنٹے تک واپس نہ آئے تو میں انہیں ڈھونڈنے نکلا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک درخت کے نیچے شیطان ایک لڑکی سے گھل مل کر باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر بُلا لیا۔ تعارف کرایا۔ یہ وہی محترمہ تھیں جو شیطان پر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اتنی جلدی شیطان اور وہ کیونکہ دوست بن گئے۔ یہ شیطان کا ٹریڈ سیکرٹ ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد شیطان میرے پاس بیٹھے بسور رہے تھے۔

"اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟" انہوں نے پوچھا۔

"خود کُشی!" میں نے جھلاّ کر کہا۔ وہ اور بھی بسورنے لگے۔

میں نے دل کھول کر ڈانٹا، دھمکایا، خبر دار کیا، لعنتیں بھیجیں۔ لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

"میں حلفیہ کہتا ہوں کہ یہ میری آخری محبّت ہے۔ پہلی اور آخری محبّت! آئندہ جو عاشق ہوں تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔ اس لڑکی کے لیے میرے دل میں ہمدردی کا طوفان موجیں مار رہا تھا۔ اس کے لیے میرے دل میں نہ صرف لا انتہا محبّت ہی پیدا ہو گئی ہے بلکہ غضب کی حسرت اور بے حد عزّت اور۔۔۔۔"

"اچھا اچھا سُن لیا۔"

اگلے روز شیطان اپنے نئے محبوب سے ملنے گئے اور مُنہ بنائے واپس آئے۔ بولے "وہ آج واپس جا رہی ہیں۔"

اچھا ہوا۔۔۔ میں نے دل میں کہا۔

"اور آج ایک ادھیڑ عمر کی خاتون سے خوب لڑائی ہوئی۔" انہوں نے بتایا۔

پوچھا کہ کہاں ہوئی اور کیوں ہوئی؟ بتایا کہ محبوب کے گھر وہ بھی مدعو تھیں۔ کوئی بحث چھڑ گئی تھی۔ شیطان نے ضرور اُلٹی سیدھی ہانکی ہوں گی، جس سے وہ خفا ہو گئیں۔

"تو اب کیا ارادہ ہے؟"

"باقاعدہ سزا دی جائے۔" شیطان نے کہا۔

"کیونکر؟"

"اُن سے محبّت کی جائے۔"

"ایک ادھیڑ عمر کی خاتون سے محبّت کروگے؟۔۔۔۔ افسوس ہے!"

"وہ ادھیڑ عمر کی ضرور ہیں لیکن 'مس' ہیں۔"

میں نے شیطان کو بہترا سمجھایا لیکن حسبِ معمول بیکار ثابت ہوا۔ شیطان نے ایک محبت نامہ لکھا جس میں ان محترمہ کی بہت تعریفیں کیں اور اخیر میں لکھا۔

"میری زندگی اس طرح تنہا ہے جیسے اکیلا جُوتا۔ اور اس طرح بے سود ہے جیسے سمندر پر بارش۔ میں اکثر رسّی کا پھندا ہاتھ میں لے کر کسی مناسب درخت کی

تلاش میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ لیکن میری قسمت کہ حسبِ منشا درخت نہیں ملتا۔" وغیرہ وغیرہ۔

اسی قسم کے چند اور محبّت نامے لکھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک روز وہ سچ مُچ ملنے آ گئیں۔ اب شیطان بہت گھبرائے اور شیطان سے زیادہ میں گھبرایا۔ وہ شیطان پر سچ مُچ عاشق ہو گئی تھیں۔ اور ان کا ارادہ شادی کا تھا۔ دونوں کو باتیں کرنا چھوڑ کر میں اندر کمرے میں جا چھپا اور شیشوں سے دیکھنے لگا۔

وہ بولیں۔ "تمہارے خطوط کتنے پیارے ہیں۔ ایک ایک لفظ محبّت میں ڈوبا ہوا ہے۔ تم نے مجھے لکھا تھا کہ جب تم دُور ہو تو میں اداس رہتا ہوں۔ بیزار رہتا ہوں۔ زندگی سے تنگ آجاتا ہوں۔"

شیطان بات کاٹ کر بولے۔ "اور آگے یہ لکھنا بھول گیا کہ جب تم نزدیک ہو تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تب بھی وہی حالت رہتی ہے۔"

"آہ! شادی کس قدر مقدس رشتہ ہے۔" وہ بولیں۔ "ذرا تاروں کی طرف تو دیکھو۔ کتنے حسین ہیں۔"

"بُرے نہیں ہیں۔" شیطان نے جواب دیا۔ "ایک تو یہ ضرورت سے زیادہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ کسی خاص ترتیب سے سجائے نہیں گئے۔ اس سے بہتر بھی ترتیب ہو سکتی تھی۔"

"تمہاری باتیں کتنی میٹھی ہیں۔ جب میں یہاں آئی تھی تو میرے سر میں درد تھا۔ اب غائب ہو چکا ہے۔"

"غائب نہیں ہوا۔" شیطان اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "اب وہ یہاں آ گیا ہے۔"

بڑی مشکلوں سے واپس گئیں۔ چلتے وقت مُصِر تھیں کہ شیطان کے کُنبے کا مفصّل پتہ اُن کو بتایا جائے تاکہ وہ براہِ راست خط و کتابت کر کے سب کچھ طے کر لیں۔

اور میں نے شیطان کو خوب ڈانٹا۔۔۔ کہ اور عاشق ہوتے پھرو خلقت پر۔

علی الصبح ناشتے پر شیطان مُنہ لٹکائے ہوئے آئے۔ ہاتھ میں ایک تار تھا۔

"خیر تو ہے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"خود پڑھ لو۔"

میں نے جلدی سے تار پڑھا۔ لکھا تھا۔ "یہ چوتھا تار ہے۔ فوراً واپس آ جاؤ۔"

"اور پہلے تین تار کہاں گئے؟"

"یہ رہے!" شیطان نے تینوں تار دے دیئے۔ شیطان کو ان کے امتحان کے سلسلے میں بلایا جا رہا تھا۔ ناشتے پر ہم دونوں کی کانفرنس ہوئی۔ شیطان ان معمّر مِس سے کافی ڈرے ہوئے تھے۔ طے ہوا کہ واپس چلیں۔

چند ہی گھنٹوں کے بعد ہم لاری میں بیٹھے تھے اور لاری میدانوں کی طرف جا رہی تھی۔ پہاڑ ختم ہوئے، پہاڑیاں آئیں۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلے آئے اور پھر دریائے گنگا اور سندھ کے زرخیز میدان۔ شیطان راستے بھر پہاڑ کو حسرت بھری نگاہوں سے مُڑ مُڑ کر دیکھتے آئے۔ شام کو ہمیں ٹرین ملی۔

شیطان بدستور پہاڑ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

جب ٹرین چلی تو شیطان نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولے۔ "محبّت، موسیقی اور کوہ ہمالیہ۔"

اور اُونٹ کی طرح زور زور سے سانس لینے لگے۔ میں چُپ رہا۔

ایک مرتبہ پھر انہوں نے دہرایا۔ "آہ! چاندنی، محبّت اور کوہ ہمالیہ۔"

میں پھر بھی چُپ رہا۔

فرماتے ہیں

سعدی صاحب فرماتے ہیں کہ ”غصّہ کبھی مت کرو، غصّیل دکاندار کے شہد پر مکھّیاں بھی نہیں بیٹھتیں۔“

فرصت ہو، آرام کرسی پر لیٹے ہوئے ہوں۔ ایک ہاتھ میں سگریٹ ہو، دوسرے میں کتاب۔ پڑھتے پڑھتے یہ فقرہ آجائے تو واللہ سرور آجاتا ہے، کیا بات ہے، خوب فرمایا ہے۔

اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ اس وقت ایک وزنی سی قسم کھاتے ہیں کہ آئندہ ہرگز غصّہ نہیں کریں گے۔ اگر کبھی غصّہ آیا بھی تو سعدی صاحب کا یہ فقرہ یاد رکھیں گے۔

اگلے روز کسی کیفے میں بیٹھ کر کافی اور سینڈوچز کا آرڈر دیتے ہیں۔ بیرا نہ جانے کہاں مر جاتا ہے۔ یوں غائب ہوتا ہے جیسے یہاں کبھی تھا ہی نہیں۔ طبیعت میں پہلے بیزاری سی آتی ہے، پھر چڑچڑاپن، پھر خون گرم ہوتا ہے اور کچھ دیر میں باقاعدہ کھولنے لگتا ہے۔ نتھنے پھڑکنے لگتے ہیں۔ جی میں آتا ہے کہ یا تو بیرے کو

قتل کر دیں یا کیفے کے مینجر کو۔ اسی وقت مینجر سے شکایت کی جاتی ہے۔ بہرہ پھر بھی نہیں آتا۔ صدیوں کے بعد آتا ہے اور "ابھی آیا" کہہ کر غائب ہو جاتا ہے۔ تب اصلی غصّہ آتا ہے اور نہ جانے کیسے کیسے خیالات دل میں آتے ہیں۔ اس وقت سعدی صاحب یاد تو آتے ہیں، ان کی نصیحت بھی یاد آتی ہے، لیکن پھر خیال آتا ہے کہ سعدی صاحب نے ہرگز ایسے فضول کیفے میں بیٹھ کر کافی اور سینڈوچز کا آرڈر نہیں دیا ہو گا۔ اور اگر دیا ہو گا تو اس قدر سست اور کام چور بیرے سے واسطہ نہیں پڑا ہو گا۔

تب ہم اپنے آپ کو حق بجانب سمجھ کر خوب غصّہ کرتے ہیں۔ دل کھول کر غصّہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ کافی زہر معلوم ہوتی ہے۔ اور سارا دن بُری طرح گزرتا ہے۔

کتابوں میں غصّہ، چوری، غریبی، ناکامی، غم، غرور ہر موضوع پر لوگ اکثر فرمایا کرتے ہیں۔ ایک صاحب فرماتے ہیں۔ "اگر ناکامیاں نہ ہوں تو کامیابی کی قدر کیونکر معلوم ہو۔" کیا پتے کی بات کہی ہے۔

دوسرے صاحب فرماتے ہیں۔ "دنیا کی نکتہ چینی سے تم تب ہی بچ سکتے ہو جب تم بُت بن کر بیٹھ جاؤ۔ نہ کچھ سوچو، نہ کچھ کہو، نہ کچھ محسوس کرو۔ یہاں تک کہ تم کچھ بھی نہ ہو۔" یہ پڑھ کر ہم داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ ”اگر تم ہوائی قلعے بناتے رہتے ہو تو کوئی ہرج نہیں۔ فقط ان قلعوں کے نیچے بنیاد رکھنی شروع کر دو۔“

پھڑک اٹھتے ہیں۔ عش عش کرنے لگتے ہیں۔

ایک اور حضرت نے فرمایا ہے کہ ”کسی چیز سے محبّت کرنے کی ترکیب یہی ہے کہ ہر وقت یہ فرض کرتے رہو کہ یہ چیز تم سے عنقریب چھِن جائے گی۔“ وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک فرمانے کا تعلق ہے۔ دنیا میں تین قسم کے آدمی ہیں۔ ایک تو وہ جن کو چوبیس گھنٹے یہی خبط رہتا ہے، جو اپنا ٹائم ٹیبل دوسروں کے فرمانے کے مطابق بناتے ہیں۔ کھانا کھاتے وقت نپولین کا حوالہ دیں گے کہ اس نے کہا ہے کہ بالکل آہستہ آہستہ کھاؤ۔ ایک نوالے کو چوبیس بار چباؤ۔ چلتے وقت بقراط کا ذکر ہو گا اس نے آہستہ آہستہ چلنے کو کہا ہے۔ حجامت کے سلسلے میں پھر نپولین کی رائے بیان کی جائے گی۔ اس کا قول ہے کہ اپنی حجامت خود بناؤ۔ حجام کا ہرگز اعتبار مت کرو کیونکہ اس کے ہاتھ میں تیز استرا ہے اور تمہاری گردن نزدیک ہے۔ نیز نپولین نے یہ بھی کہا تھا کہ رات کو دیر تک جاگتے رہو۔ اس سے دماغ روشن رہتا ہے۔ (لیکن نپولین تو گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے سو جایا کرتا تھا۔ اس کا نہ کوئی حوالہ دیتا ہے نہ اس پر عمل کرتا ہے)۔

"فرماتے ہیں" کے معتقد ہنسنے ہنسانے سے منکر ہوتے ہیں۔ کیونکہ حکیم بو علی سینا نے فرمایا ہے کہ جو زیادہ ہنستے ہیں وہ جلد روئیں گے۔ دوسروں پر ہنسنا وہ گناہِ عظیم سمجھتے ہیں، کیونکہ چندر گپت موریا صاحب فرماتے ہیں کہ کسی شخص پر ہنسنے سے پہلے یہ یاد رکھو کہ اگر تم اس کی جگہ ہوتے تو کیا محسوس کرتے۔

اگر چوری ہو جائے تو چور کا سراغ لگانے کی زیادہ کوشش نہیں کرتے کیونکہ نانا فرنویس صاحب نے فرمایا ہے کہ ممکن ہے کہ اس چیز کی چور کو تم سے زیادہ ضرورت ہو۔

غرضیکہ ایسے حضرات کی گفتگو میں گفتگو کم ہوتی ہے اور "فرماتے ہیں" زیادہ۔

دوسری قسم وہ ہے جو اس سلسلے میں بالکل منکر ہے۔ کوئی فرمایا کرے، اُن کی بلا سے۔

شیکسپیئر اگر دُور سے پیدل چل کر آئے اور ان سے کچھ کہے تب بھی وہ سُنی اَن سُنی کر دیں گے۔ اگر ملٹن ان کو جھنجھوڑ کے رکھ دے اور ان کے کانوں میں چلّا چلّا کر کوئی نصیحت کرے تب بھی ان کے کان پر جوں نہ رینگے گی۔ کنفیوشس

اگر ہاتھ جوڑ کر منّتیں کرے کہ کبھی خدا کے لیے ہماری اس ہدایت پر عمل کر کے ہمیں ممنون کرو، تب بھی انہیں ترس نہ آئے گا۔

ایسے حضرات سے اگر آپ کہیں کہہ دیں کہ فلاں صاحب یہ فرماتے ہیں۔ پہلے تو وہ خاموش رہیں گے۔ دوبارہ کہنے پر پوچھیں گے کہ "فلاں صاحب کون تھا؟"

آپ کے بتانے پر کہیں گے۔ "اچھا تو فرماتا ہو گا۔ ہمیں کیا؟"

اگر آپ نے زیادہ زور دیا تو کچھ اس قسم کی گفتگو ہو گی۔

"فلاں صاحب یہ فرماتے ہیں۔"

"تو فرمانے دیجئے۔"

"لیکن وہ اسی موضوع پر تو فرماتے ہیں۔"

"بڑے شوق سے فرمایا کریں، انہیں روکتا کون ہے۔"

"لیکن سنئے تو۔۔۔!"

"ان سے درخواست کس نے کی تھی کہ فرمائیں؟"

"لیکن!"

”بھلا وہ کس وقت فرماتے تھے؟ صبح کو یا شام کو؟ موسم کون سا تھا؟“

تیسرا طبقہ وہ ہے جو نہ تو معتقد ہی ہے اور نہ منکر۔ جو فرمانے کو مانتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔ جو فرمائی ہوئی باتوں پر سوچنے بیٹھ جاتے ہیں۔ مثلاً مسٹر ڈسرائیلی صاحب فرماتے ہیں کہ ”میں زندگی میں چاہے جتنی حماقتیں کروں لیکن محبّت کے لیے شادی ہرگز نہیں کروں گا۔“

اسی مضمون پر ڈاکٹر جانسن صاحب فرماتے ہیں۔ ”جو انسان محض محبّت کے لیے شادی کرتا ہے وہ نہایت کمزور انسان ہے۔“

ان دونوں حضرات کا فرمانا سر آنکھوں پر لیکن یہاں یہ الجھن پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر محبّت کے لیے شادی نہ کی جائے تو کیا نفرت کے لیے کی جائے۔ محبوب سے شادی نہ کی جائے تو کیا اس سے کی جائے جس کی شکل سے بیزار ہوں۔

بائرن صاحب فرماتے ہیں۔ ”اگر کوئی صاحبِ قلم اپنی تحریر کے زور سے اپنے محبوب کو نہ جیت سکے تو اس پر لعنت ہے۔“

ہم بائن صاحب کے تخیل کی داد دیتے ہیں لیکن صاحبِ قلم کی قدر و قیمت کون نہیں جانتا؟ اور محبوب کو جیتنا تو باقاعدہ ایک مہم ہے۔

اس کی جگہ یہ ہونا چاہیے تھا۔ ''اگر کوئی امیر کبیر شخص اپنے روپے کے زور سے اپنے محبوب کو نہ جیت سکے تو اس پر لعنت ہے۔ (امیر کبیر شخص پر۔ محبوب پر نہیں)۔''

نپولین صاحب نے نوالے کو چالیس بار چبانے کو کہا ہے۔ سو ہم اس سلسلے میں معذور ہیں۔ نوالے چبانے کے علاوہ ہمیں اور کام بھی رہتے ہیں۔

ایک صاحب فرماتے ہیں کہ رات کو جلد سو جانے سے صحت اچھی رہتی ہے۔ ادھر نپولین صاحب کا اصرار ہے کہ رات کو دیر تک جاگتے رہنے سے دماغ روشن رہتا ہے۔ بتایئے صحت کا خیال رکھیں یا دماغ کی روشنی کا۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ دشمن کو ہمیشہ معاف کر دو۔ دوسرے فرماتے ہیں، دشمن کو پکڑ کر اتنا پیٹو کہ وہ ساری دشمنی بھول جائے۔

ایک صاحب کا قول ہے کہ بالکل تھوڑا کھاؤ اور ہر وقت بھوکے رہو۔ ایک جنرل کا قول ہے کہ خوب دبا کر کھاؤ اور جب کھا چکو تو پھر کھاؤ۔

ایسے اقوال پڑھ پڑھ کر ان سے ہمارا عقیدہ اُٹھ گیا ہے۔ جب ہم کسی مشہور ہستی کا مشہور قول پڑھتے ہیں تو فوراً یہ خیال آتا ہے کہ کسی اور مشہور ہستی کا کوئی اور مشہور قول ضرور ہو گا جو اس کے بالکل اُلٹ ہو گا۔

ہمیں ایک شکایت ہے۔ وہ یہ کہ لوگ غیر سنجیدہ اقوال نہ پسند کرتے ہیں، نہ اُن کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ شاید ان کا یہ خیال ہے کہ جو قول سنجیدہ نہیں وہ قول ہی نہیں ہے۔ لیکن ہمیں ایسے قول بہت پسند ہیں۔

مثلاً ایک مشہور ادیب فرماتے ہیں۔ ''مجھے محنت و مشقت بیحد پسند ہیں۔ میں اکثر کسی درخت کے سائے میں بیٹھ کر سارا سارا دن لوگوں کو محنت کرتے دیکھتا رہتا ہوں۔''

ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ ''مجھ پر بڑی بڑی مصیبتوں نے ستم ڈھائے ہیں اور میں خوب کُڑھا ہوں۔ لیکن ان میں سے زیادہ ایسی تھیں جو کبھی مجھ تک نہیں پہنچیں۔''

دوبارہ فرماتے ہیں۔ ''امارت ایک ایسی چیز ہے جسے ہم بڑی مشکل سے برداشت کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کسی دوسرے شخص کی امارت۔''

ایک اور صاحب فرماتے ہیں۔ ”جن لوگوں کو گھوڑوں اور خچروں کا شوق ہوتا ہے اور جو عمر بھر ان پر فریفتہ رہتے ہیں، کچھ عرصے کے بعد گھوڑوں اور ان لوگوں میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

یہاں ہم ان سے متفق ہیں ہمیں خود حیوانات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ حیوانات سے محبّت کرنے کے نتائج کو کس خوبی سے ادا فرمایا ہے۔

ایک حضرت فرماتے ہیں۔ ”اگر ہم ہر ایک کو پتہ چل جائے کہ ہر ایک، ہر ایک کے متعلق کیا باتیں کرتا ہے تو کوئی کسی سے بولنا بھی پسند نہ کرے۔“

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کا جی تو چاہتا ہے کہ ”فرماتے ہیں“ کی اہمیت جتائیں لیکن ساتھ ہی اپنی لاعلمی بھی چھپانا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس طرح گفتگو کرتے ہیں:

”آپ تو ناحق رنج کرتے ہیں؟ کیا آپ وہ بھول گئے جو کسی نے غم کرنے پر کہا ہے؟ ایسا ہی کچھ ہے۔۔۔یعنی۔۔۔۔۔“

”ہاں مجھے بھی یاد تھا۔ کسی نہایت مشہور آدمی نے کہا ہے اور خوب کہا ہے صاحب اس مضمون پر ایک اور بہت بڑے حکیم نے فرمایا تھا۔ یہ فرماتے ہیں کہ غم مت کرو کیونکہ۔۔۔۔ افوہ! ابھی ابھی بھول گیا۔“

"میں نے یہ بھی سُنا ہے، مجھے بھی یاد تھا۔ بھولنے پر بھی تو ایک مشہور و معروف قول ہے۔۔۔۔۔ نہایت ہی باموقعہ ہے۔۔۔۔۔ دیکھئے کیا تھا۔۔۔۔۔۔۔؟"

"عجب تماشا ہے، لیکن میں آج سب کچھ بھولتا جارہا ہوں، یقین کیجئے، آج صبح مجھے یاد تھا!"

ایسے حضرات اکثر کہاوتوں پر اُتر آتے ہیں اور کہاوتوں کو زبردستی "فرماتے ہیں" میں سمو دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ بھُس میں آگ لگا، جمالو دُور کھڑی۔ علامہ ٹیگور فرماتے ہیں کہ گھر کی مرغی دال برابر۔ چنگیز خان فرماتے ہیں کہ مُلّا کی دوڑ مسجد تک۔

جہاں تک کہاوتوں کا تعلق ہے، ہمیں ان پر کچھ زیادہ اعتقاد نہیں، کیونکہ ان میں سے اکثر کہاوتیں غلط ہیں۔ "چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے" یہ کسی قنوطی کی ایجاد کردہ کہاوت معلوم ہوتی ہے۔ اگر آپ حساب لگائیں تو چاندنی راتیں اور اندھیری راتیں تقریباً برابر برابر ہوتی ہیں۔ اگر کوئی زندہ دل ہوتا تو وہ ایسی کہاوت کو یوں کہتا۔ "چار دن کا اندھیرا اور پھر چاندنی رات ہے۔"

"نیا نو دن، پرانا سو دن" پر کوئی عمل کرنے لگے تو نئی چیزیں خریدنا چھوڑ دے۔ پرانی چیزیں کباڑیوں سے خرید خرید کر استعمال کیا کرے۔ مگر جو چیز پرانی ہے وہ کبھی تو نئی ہو گی۔

جب ہم بریلی گئے تو وہ "اُلٹے بانس بریلی کو" والی کہاوت ہمارے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ وہاں بانس زیادہ ہوں گے اور بریلی کم ہو گی۔ لیکن ہم بہت مایوس ہوئے۔ کہاوت بالکل غلط تھی۔

یہ کتّے کی دُم والا تجربہ بھی ہمیں یونہی معلوم ہوتا ہے۔ بھلا کس کو مصیبت پڑی ہے کہ اتنا طویل تجربہ کرے اور وہ بھی کتّے کی دُم پر۔

اور پھر سو سال تک کون جیتا ہے؟ ہندوستان میں لوگ زلف کے سر ہونے تک نہیں جیتے، سو سال تو ایک طویل عرصہ ہے۔

کتّے کی دُم بعض اوقات سیدھی ہو جاتی ہے۔ ہم نے خود دیکھی ہے۔

اگر کوئی "فرماتے ہیں" پر سچ مُچ عمل کرنے لگے اور ہر ایک کے فرمانے کی تعمیل شروع کر دے تو اس کا کیا حشر ہو گا؟

اس شخص کی ذرا دماغی تصویر بنایئے۔ نہ اسے غصّہ آتا ہے، نہ رشک، نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا ہے۔ کوئی پتھر مار دے تو بالکل خفا نہیں ہوتا بلکہ دوسرا گال پیش کر

دیتا ہے۔ چوری ہو جائے تو تفتیش نہیں کرتا۔ بے حد مطمئن ہے، مسرور ہے۔ چوبیس گھنٹے مُسکراتا رہتا ہے۔ ہر وقت دوسروں کی خدمت میں حاضر ہے۔ کسی سے کچھ طلب نہیں کرتا۔ یقیناً ایسے شخص کو اس دنیا کی آب و ہوا اور موسمی حالات موافق نہیں آئیں گے۔

ویسے ''فرماتے ہیں'' کا ایک فائدہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ کبھی کبھی اس کے استعمال سے آپ دوسروں کو متاثر کر سکتے ہیں۔

سگریٹ نوشی کے خلاف باتیں ہو رہی ہوں تو فوراً کہہ دیجئے کہ لارڈ کرزن صاحب فرماتے ہیں کہ سگریٹ پینے سے بہتر تو یہ ہے کہ انسان زہر پی لے۔

اور اگر سگریٹ نوشی کی تعریفیں ہو رہی ہوں تو کہہ دیجئے کہ مہا کوّی کالیداس فرماتے ہیں کہ ''تمباکو ہی ایک ایسا نشہ ہے جو نشہ ہے بھی اور نہیں بھی۔''

یونہی کسی کا نام لے کر جو جی میں آئے کہہ دیجئے۔

اب رہے بڑے آدمیوں کے نام، سو جہاں کچھ شبہ ہو یا اور نام یاد نہ آتے ہوں، تو وہاں فوراً شیکسپیئر کا نام لے لیجئے۔ کسی کی کیا مجال ہے جو آپ کو ٹوک دے۔ شیکسپیئر نے دنیا کے ہر موضوع کے ہر پہلو پر کچھ نہ کچھ ضرور فرمایا ہے۔

اس کا نام آپ جب چاہیں بِلا جھجک لے سکتے ہیں۔

اگر حساب لگایا جائے تو سب سے زیادہ شیکسپیئر صاحب فرماتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر سعدی صاحب اور تیسرے نمبر پر گوئٹے، کنفیوشس اور نطشے آتے ہیں۔

جہاں تک ہمارا خیال ہے جو حضرات فرماتے تھے وہ بھی آپ کی ہماری طرح ہی تھے۔ غصّے کے خلاف فرمانے والے نوکروں پر اس قدر خفا ہوتے تھے کہ آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ لڑائی جھگڑے کی برائیوں کے متعلق فرمانے والے مار پیٹ میں سب سے آگے رہتے تھے۔ قرض کے نقصانات پر فرمانے والے اکثر مقروض رہتے تھے۔

وہ سب کے سب ہم آپ جیسے انسان تھے۔

باقی رہا فرمانا، سو فرصت کے وقت جب کبھی دُور کی سوجھتی ہو گی تو فوراً فرما دیتے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ فرمانے کے بعد بالکل بھول جاتے ہوں کہ کیا فرمایا تھا۔

ڈاکٹر جانسن فرماتے ہیں کہ ”جو شخص صبح دیر سے اُٹھتا ہے، وہ زندگی بھر کوئی معرکے کا کام نہیں کر سکتا۔“

حالانکہ ڈاکٹر جانسن خود زندگی بھر علی الصبح نہیں اُٹھے۔ ہمیشہ دیر سے اُٹھتے تھے۔

لیکن کبھی فرصت میں آرام کرسی پر لیٹ کر مطالعہ کر رہے ہوں اور کوئی مقولہ سامنے آجائے کہ فلاں صاحب یوں فرماتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے تو سرور آجاتا ہے۔ سر جھومنے لگتا ہے۔ اسی وقت ایک بوجھل سی قسم کھاتے ہیں کہ آئندہ اس پر ضرور عمل کریں گے۔

واللہ! کیا بات ہے۔ خوب فرمایا ہے صاحب!

تکیہ کلام

تکیہ کلام نہایت مفید چیز ہے اور سچ مُچ گفتگو کا تکیہ ہے۔ یعنی باتیں کرنے والا جب چاہے اس کا سہارا لے سکتا ہے۔

ہمیں وہ تکیہ کلام پسند نہیں جس کی عادت پڑ جائے اور جس پر قابو نہ رہے کیونکہ جو چیز بے قابو ہو جائے اس میں آرٹ نہیں رہتا۔ ہمارے خیال میں قابلِ تعریف وہی تکیہ کلام ہے جو ضرورت کے مطابق اختیار کیا گیا ہو۔ وہ ہمیشہ آڑے آتا ہے۔

یہ ہماری انتہائی ناتجربہ کاری ہے کہ گفتگو کی ابتدا میں ہم ان دونوں میں بالکل تمیز نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات تو ہم گفتگو میں کسی تکیہ کلام کی موجودگی تک نہیں پہچان سکتے اور اس قسم کے حادثے اکثر ہوتے رہتے ہیں؟

ایک صاحب کشمیر کا ذکر کر رہے ہیں۔۔۔۔

”جب میں کیا نام وہاں گیا، تو تقریباً تقریباً سب قابلِ دید مقامات کی کیا نام سیر کی۔ اور وہ جھیل کیا نام بھی دیکھی، وہ جو مشہور کیا نام جھیل ہے نا؟“

”ڈل ہے اس کا نام۔“ ہم لقمہ دیتے ہیں۔

”ہاں کیا نام ڈل جھیل بھی دیکھی، سری نگر میں نشاط اور شالامار باغ بھی کیا نام دیکھے۔ اور وہ کیا نام چشمہ بھی دیکھا۔ خوب ہے وہ چشمہ کا نام۔۔۔۔۔۔!“

”جی شاہی چشمہ ہے اس کا نام۔“

”تو کیا نام شاہی چشمہ بھی دیکھا!“

اسی طرح گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ اور بہت دیر میں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کیا نام تو ان کا تکیہ کلام ہے۔ اپنی کم علمی پر افسوس ہوتا ہے۔

ایک اور صاحب ہمیں اپنے گھر کے پالیٹکس سُنا رہے ہیں۔

”میں نے کہا جب مصیبت میں گرفتار ہوں۔ نہ صرف آدمی بیمار ہیں بلکہ میں نے کہا جانور تک علیل ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ آج صبح جب حکیم صاحب آئے میں نے کہا۔“

"کیا کہا آپ نے۔۔۔۔۔ حکیم صاحب سے؟" ہم انتہائی معصومیت سے پوچھتے ہیں۔

"میں نے کہا حکیم صاحب سے یہ کہا کہ آپ بھی ہمارے ہاں کی بیگار سے تنگ آ گئے ہوں گے۔ وہ بولے یوں مت کہیئے۔ میں تو آپ کا غلام ہوں میں نے کہا۔"

"کس نے کہا؟ حکیم صاحب نے یا آپ نے؟"

"حکیم صاحب نے میں نے کہا۔ اس کے بعد وہ پوچھنے لگے کہ دوائیوں پر کس قدر خرچ آ چکا ہے، میں نے کہا؟"

"آپ نے کیا کہا؟"

بعض اوقات تو گھنٹوں باتیں ہوتی رہتی ہیں اور ہمیں تکیہ کلام کا پتہ نہیں چلتا۔ کئی حضرات ہم سے محض اسی وجہ سے خفا ہو گئے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہم ان کے تکیہ کلام کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

لیکن کئی اصحاب ایسے ہیں جو تکیہ کلام یوں پکڑ لیتے ہیں جیسے کوئی اعلیٰ درجے کا وکٹ کیپر شپ سے کیچ پکڑ لے۔

ہمیں ایسے اصحاب پر رشک آتا ہے۔

ہم ایک صاحب سے ملنے جاتے ہیں۔ یہ حجامت کر رہے۔ میز پر تازہ اخبار پڑا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ پرچے سے تازہ خبریں پڑھ کر سناؤ۔

ہم اخبار پڑھنا شروع کرتے ہیں لیکن وہ اپنی حجامت میں اس قدر مشغول ہیں کہ ہم طویل سے طویل قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک لفظ نہیں سُن رہے۔

غالباً انہیں یہ ڈر تھا کہ انہیں یوں مصروف دیکھ کر ہم چلے نہ جائیں۔ چنانچہ وہ ایسا انتظام کرتے ہیں کہ ہم بھی بیکار نہ بیٹھیں اور وہ بھی اپنی حجامت کے مراحل با آسانی طے کر لیں۔ بس کبھی کبھار وہ ہمیں ایک اچھا سے سرفراز فرما دیتے ہیں۔

ہم ایک خبر پڑھتے ہیں۔ "ایک بیکار نوجوان نے ملازمت مل جانے کی خوشی سے بے قابو ہو کر خودکُشی کر لی۔ اس خبر سے شہر میں سنسنی پھیل گئی ہے۔ مزید اطلاعات کا انتظار ہے۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔"

"اچھا آ آ۔" وہ بُرش سے جھاگ بناتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"دریائے گھربدا میں سخت طوفان۔ ہزاروں آدمی چلو بھر پانی میں ڈوب کر مر گئے۔ فصلوں کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ ہمیں اُمّیدِ کامل ہے کہ اس سال نہیں تو اگلے سال اس علاقے میں ضرور قحط پڑے گا۔ اس خبر سے کاروباری دنیا میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ گیہوں کا نرخ دن بہ دن گرتا جارہا ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں بالکل ہی نہ گر پڑے۔"

"اچھا۔" وہ بلیڈ تیز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"جزائر شرق الہند کے مشہور لیڈر کی جوشیلی تقریر جس نے باشندوں کو غیرت دلاتے ہوئے کہا کہ اگر تم میں حُبّ الوطنی کا ذرا بھی مادہ ہے، اگر تم اپنے ملک کو سچ مُچ چاہتے ہو اور اسے دیگر ممالک کے دوش بدوش دیکھنا چاہتے ہو تو نوجوانو دیکھتے کیا ہو اس سال لانگ جمپ میں دنیا کا ریکارڈ توڑ کر دکھادو۔"

"اچھ۔۔۔۔ چھا!"

"قطب شمالی میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ وہاں اس قدر سردی پڑ رہی ہے کہ ہزاروں وہیل مچھلیاں اور لاکھوں برفانی ریچھ منجمد ہو کر برف کے تودے بن گئے۔ اسکیمو موسم کے اس تغیّر پر خوشیاں منارہے ہیں۔"

"اچھا۔۔۔ آہاہاہا؟"

غرضیکہ ہم آدھ گھنٹے تک خبریں سناتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ خبریں ختم ہو جاتی ہیں اور اشتہار تک سنانے پڑتے ہیں۔ اُدھر وہ تھوڑی دیر کے بعد اچھا کہہ دیتے ہیں۔ یہ اچھا ہر مرتبہ ایک نئے انداز سے کہا جاتا ہے۔ کبھی گھبرا کر، کبھی بزرگانہ شفقت کے ساتھ، کبھی طفلانہ معصومیت کے ساتھ، کبھی انتہائی لاپرواہی سے۔

تب ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ 'اچھا' ان کا تکیہ کلام ہے اور اگر انہیں ہے اور محض ہمارے لیے تکیہ کلام بنایا گیا ہے تو ہم ان کے مذاق کی داد دیتے ہیں۔

ایک بہت بڑے شکاری کے اعزاز میں بہت بڑی پارٹی ہوئی۔ شکاری صاحب اس قدر باتونی تھے کہ عشاء کی اذان سے پہلے اپنی داستان شروع کرتے اور صبح کی اذان سُن کر ختم کیا کرتے۔ کھانے کے بعد انہوں نے شیر کے شکار سے بسم اللہ کی۔

بولے۔ ”رات کے کوئی دو بجے ہوں گے۔ اندھیرا گھُپ، ہُو کا عالم۔ ایسے گھنے جنگل کی ایسی بھیانک رات میں مچان پر بیٹھا شیر کا منتظر تھا۔ ایسے ماحول میں کس قسم کے خیالات آتے ہوں گے؟ یہ شاید آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کیونکہ۔۔۔۔“

”پھر کیا ہوا؟“ ایک بزرگ جو بالکل ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے بولے۔

”ذرا سی آہٹ پر میں چونک پڑتا۔ پتہ کھٹکتا تو میرا دل دھڑکنے لگتا۔ آسمان پر سیاہ گھٹا تُلی کھڑی تھی، جس نے ستاروں کی مدھم سی روشنی بھی چھین لی تھی۔ وہ ایک ایسی ڈراؤنی رات تھی کہ میں کیا بتاؤں!“

”بہت خوب۔ تو پھر کیا ہوا؟“ انہی بزرگ نے پوچھا۔

”اتنے میں ایک عجیب سا شور سنائی دیا جیسے جنگل کا جنگل جاگ اُٹھا ہو۔ پرندے چہچہانے لگے، درندے اپنی بولیاں بولنے لگے۔ غرضیکہ طوفان سا آ گیا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

اس مرتبہ شکاری نے بہت برا مُنہ بنایا۔

”اتنے میں ایک زبردست گرج سنائی دی، جیسے ہزاروں توپیں یکلخت چل جائیں۔ حضرات کبھی جنگل میں شیر کی گرج آپ نے نہیں سُنی۔ چڑیا گھر کے شیر

کی گرج سُنی ہو گی۔ اس کی گرج اصلی شیر کے مقابلے میں بلّی کی میاؤں میاؤں سے زیادہ نہیں۔ وہ گرج تو اس قدر ہیبت ناک ہوتی ہے کہ۔۔۔۔۔۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"شیر نزدیک آ گیا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں یوں روشن تھیں جیسے بجلی کے قمقمے۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ فائر کروں یا نہ کروں۔۔۔۔"

"اچھا؟ تو پھر کیا ہوا؟"

شکاری صاحب کا چہرہ سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔

"میں نے شِست لی اور گھوڑا دبا دیا، لیکن کچھ نہ ہوا۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ بندوق تو خالی ہے۔ کارتوس تھیلے میں بند تھے اور تھیلہ درخت کے نیچے گھاس پر پڑا تھا۔ کچھ دیر تو سوچتا رہا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں، آخر جان پر کھیل کر نیچے اُترنے لگا۔ شیر نے میری طرف دیکھا، حضرات! ذرا دماغی تصویر تو بنائیے۔۔۔۔"

"بنالی! پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ ہوا۔" شکاری صاحب جھلّا کر بولے۔ "کہ دو کارتوس میری جیب میں بھی پڑے ہوئے تھے۔ جلدی سے نکال کر بندوق میں بھرے اور فائر کیا۔ گولی شیر کی پیشانی پر لگی۔"

"یعنی شیر مر گیا۔ پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہوا۔۔۔" شکاری صاحب بالوں کو نوچتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شاید یہ کہنا چاہتے تھے کہ پھر میرا سر ہوا۔

وہی شکاری صاحب جن کے متعلق ایسی ایسی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں اور جن کے اعزاز میں لوگ رَتجگا منانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ "پھر کیا ہوا؟" کے تکیہ کلام سے پانچ منٹ میں ہتھیار ڈال کر بھاگ گئے۔

ایک دفعہ ہم بزرگ کے پاس بیٹھے کرکٹ کے سلسلے میں اپنے معرکے بیان کر رہے تھے۔

"ایک کھلاڑی اس بُری طرح جما ہوا تھا کہ کمبخت آوٹ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ جب اس کا سکور کافی ہو گیا تو مجھے گیند ملی۔ اور کوئی ہوتا تو گھبراتا، لیکن میں نے نہ جانے کتنے ایسے موقعے دیکھے ہیں۔ لمبا اسٹارٹ لے کر چلا۔ نہایت ہی تیز آف بریک پھینکی۔ شوں سے گیند گئی اور جناب کی وکٹیں غائب تھیں۔"

"ہاں! ہو سکتا ہے۔" بولے۔

"اس کے بعد آف بریک سے میں نے تین کھلاڑی اور نکالے۔ حالانکہ وہ بہترین بیٹسمین تھے۔ ذرا غور کیجئے۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"جی نہیں، یہ سچ مُچ ہوا تھا۔ اخباروں میں بھی چھپا تھا۔ آپ کہیں تو میں لا کر دکھا دوں۔ اب ہماری باری آئی۔ شام کا وقت تھا اور کھیلنے کے لیے صرف آدھ یا پون گھنٹہ باقی تھا۔ کپتان نے سوچا کہ وکٹ خراب ہے اچھے کھلاڑی بھیجے تو کہیں اُڑ نہ جائیں۔ اس نے مجھے اور میرے ایک دوست کو بھیج دیا۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"ویسے ہم دونوں آخر میں جایا کرتے تھے۔ ہم نے بڑی شان سے اننگز شروع کی۔ بڑے مزے سے کھیلے اور شام تک آؤٹ نہیں ہوئے!"

"خیر ہو سکتا ہے۔"

"جی نہیں حقیقت ہے۔ اگلے روز تو ہم خوب کھیلے اور وہ ہٹیں لگائیں کہ بس مزا آ گیا۔ میں نے لنچ تک اسّی سکور کر لیا۔"

"ہاں ہو سکتا ہے۔"

"آپ یقین کیجئے، لنچ کے بعد میں نے اور بھی سکور کیا!"

"کیا ہو گا۔۔۔ ہو سکتا ہے۔" وہ بولے۔

اور موضوع تبدیل ہو گیا۔

وہ بزرگ یا تو نجومی تھے یا پہنچے ہوئے تھے جو انہوں نے ہماری کسی بات کا بھی یقین نہ کیا۔ ہم جھوٹ بول رہے تھے یا سچ یہ ہم ہی جانتے ہیں۔ بہر حال، ان کا تکیہ کلام خوب تھا۔

کبھی کبھی اس قسم کی گفتگو بھی سُننے میں آتی ہے۔

ایک مولانا سینما پر تنقید کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں۔۔۔۔

"مجھے یہ شیطانی کارخانہ بالکل پسند نہیں۔ تصویریں حرکت کرتی ہیں۔ نعوذ باللہ! تصویروں کو اس قدر پسند کرتے ہو اور دوسروں کو بھی ترغیب دیتے ہو، لاحول ولا قوۃ الا باللہ! یہ بُت پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟"

"لیکن اخلاقی اور مذہبی فلمیں بھی تو ہوتی ہیں۔"

"اگر اخلاقی اور مذہبی ہوں تو سبحان اللہ، بلکہ جزاک اللہ۔ یقین مانو کہ حاشاء وکلا میں ایسی فلموں کے خلاف نہیں ہوں۔ اگر فلمیں مفید سبق سکھلائیں تو بسم اللہ، اگر دِلوں کو نور اور پاکیزگی سے بھر دیں تو الحمد للہ۔"

"تو آج کی فلم کیسی تھی؟"

"میں تو ماشاء اللہ خود قدامت پسند نہیں، لیکن آج کی فلم تو ایسی تھی کہ بس انّا للہِ!"

غرضیکہ جب تک بحث ہوتی رہے گی یہ الفاظ اتنی تیزی سے بار بار آئیں گے کہ اصلی تکیہ کلام دریافت کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان مولانا کا کوئی خاص تکیہ کلام نہیں ہے بلکہ سب کچھ ملا کر پورا بسترۂ کلام ہے۔

ہمارے ایک دوست نے ایک مسخرے ایکٹر کا قصّہ سنایا جو اسٹیج پر چھوٹے چھوٹے ایکٹ کرتا تھا اور لوگوں کو ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیتا تھا۔

وہ تین فقروں کو باری باری بطور تکیہ کلام استعمال کرتا۔ وہ فقرے یہ تھے۔

"کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟"

"ناراض مت ہوئیے۔"

"آپ تو مذاق پر اُتر آئے۔"

ایک سین میں ایک بگھی دکھائی جاتی ہے۔ بگھی رُکتی ہے اور آپ باہر تشریف لاتے ہیں۔ کوچوان کو کرایہ دیتے ہیں۔ کوچوان کہتا ہے کرایہ تھوڑا ہے اور جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔

"کرایہ پورا دیجئے۔" کوچوان کہتا ہے۔

"کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟" یہ پوچھتے ہیں۔

"سنجیدہ نہیں تو کیا بات کر رہا ہوں۔ دن بھر آپ کو لیے لیے پھرا ہوں اور اب آپ آدھے کرائے پر ٹالنا چاہتے ہیں۔"

"ناراض مت ہوئیے۔"

"میں ناراض نہیں ہوں، اپنا کرایہ مانگتا ہوں۔ اپنا پورا کرایہ۔۔۔۔۔ سمجھے آپ؟"

"آپ تو مذاق پر اُتر آئے۔"

"میں مذاق وذاق کچھ نہیں جانتا۔ کہتا ہوں کہ آپ براہِ کرم میرا پورا کرایہ۔۔۔!"

"کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟"

"اس میں کوئی شک ہے (زور سے) اگر دن بھر دھکے کھا کر بھی سنجیدہ نہ ہوا تو کب ہوں گا؟"

"ناراض مت ہوئیے۔"

"میں ناراض نہیں ہوں۔ یقین کیجئے کہ آپ سچ مُچ نصف کرایہ دے رہے ہیں۔ اتنا ہی کرایہ اور عنایت فرمائیے۔"

"آپ تو مذاق پر اُتر آئے۔"

"یہ مذاق ہے۔ غضب خدا کا! (چلّا کر) پورا کرایہ مانگنا مذاق ہے؟ اپنی مزدوری مانگنا مذاق ہے؟"

"کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟"

"ہاں سنجیدہ ہوں! بالکل سنجیدہ ہوں۔ (چنگھاڑ کر) سو فیصدی سنجیدہ ہوں۔ میں کہتا ہوں اگر آپ۔۔۔۔"

"ناراض مت ہوئیے۔"

"خدایا! (دھاڑتے ہوئے) سمجھ نہیں آتا کیا کروں؟ میں ہرگز ناراض نہیں ہوں۔ ناراض کون گدھا ہوتا ہے۔ فقط آپ اتنے ہی دام اور دے دیجئے اور میں یہاں سے فوراً دفعہ ہو جاؤں گا۔"

"آپ تو مذاق پر اُتر آئے۔"

اور کوچوان اپنے بال نوچتا اپنی قسمت کو کوستا ہوا چلا جاتا ہے۔

دوسرے سین میں دکھایا جاتا ہے کہ چند حضرات بیٹھے سیاسیات پر بحث کر رہے ہیں۔ آپ بھی تشریف فرما ہیں۔ ایک صاحب گلیڈ اسٹون کا مقابلہ ڈسرائیلی سے کرتے ہیں۔ اور ڈسرائیلی کی تعریفیں کرنے لگتے ہیں۔ بحث گرم ہوتی جاتی ہے۔ جب کھولنے لگتی ہے تو آپ بیچ میں کود پڑتے ہیں اور ڈسرائیلی کے حمایتی سے اُلجھ جاتے ہیں۔

حمایتی فرماتے ہیں۔ "آپ ڈسرائیلی کا گلیڈ اسٹون سے مقابلہ کرتے ہیں؟ کُجا یہ، کُجا وہ صاحب۔ کوئی مقابلہ ہی نہیں۔"

"کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟" یہ پوچھتے ہیں۔

"جی ہاں! یقیناً! معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تاریخ کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ اگر یہ بات ہے تو آپ سے بحث کرنا فضول ہے۔"

"ناراض مت ہوئیے۔"

"اگر آپ کو تاریخ یاد ہوتی تو آپ ڈسرائیلی جیسے بیدار مغز، روشن دماغ، ذہین الطبع کہنہ مشق۔۔۔۔"

"آپ تو مذاق پر اُتر آئے۔"

”چہ خوب! آپ اسے مذاق سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ آج تک ڈسرائیلی جیسا دور اندیش اور تجربہ کار سیاستدان پیدا نہیں ہوا۔“

”کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟“

”سنجیدہ نہیں تو اور کیا ہوں؟ کیا میرے بولنے میں نقص ہے یا خدا نخواستہ آپ کی سماعت میں خلل ہے؟“

”ناراض مت ہوئیے۔“

”ناراض کون ہوتا ہے؟ میں جو کہتا ہوں اسے آپ سنتے بھی ہوں۔ کیا آپ نے مجھے احمق سمجھ رکھا ہے؟“

”آپ تو مذاق پر اُتر آئے۔“

”یہ مذاق کی بھی ایک ہی رہی۔ عجب تماشا ہے۔ مذاق کون نالائق کر رہا ہے؟ میں تو نا صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ڈسرائیلی جیسا عالی دماغ جہاندیدہ ذہین ہردلعزیز۔۔۔“

”کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟“

اسی طرح گفتگو جاری رہتی ہے۔ آس پاس بیٹھے ہوئے حضرات مُسکرانے لگتے ہیں اور آخر میں ہنس پڑتے ہیں۔ اور بحث ختم ہو جاتی ہے۔

ہمارا خیال تھا کہ یہ تماشا صرف اسٹیج پر ہی ہو سکتا ہے لیکن فوراً ہی ہم نے اسے عام زندگی میں ہوتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔

ہمارے ایک دوست کو گھنٹوں ایک بزرگ کے پاس بیٹھنا پڑتا تھا۔ ہمارے دوست کسی امتحان کی تیاری میں مشغول تھے۔ اُدھر وہ بزرگ مشکل سے مشکل موضوع تلاش کر کے اس پر گفتگو کیا کرتے۔ ہمارے دوست کو مجبوراً شامل ہونا پڑتا تھا ورنہ بزرگ خفا ہو جاتے اور ان کی خفگی ہمارے دوست کے لیے امتحان میں فیل ہو جانے سے زیادہ خطرناک تھی۔

ایک دن ہم نے دیکھا کہ بزرگ نظامِ شمسی پر گفتگو کر رہے ہیں اور ہمارے دوست آڑ لیے ایک چھوٹی سی کاپی کھولے بیٹھے ہیں۔ کبھی کبھار بزرگ کی طرف دیکھ کر مُسکرا دیتے ہیں اور پھر گود میں رکھی ہوئی کاپی کو پڑھنے لگتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ یہ الفاظ بطور تکیہ کلام استعمال کر رہے ہیں۔

"جی!"

"کمال ہے!"

"اچھا؟"

بزرگ دُمدار ستاروں کے متعلق کچھ فرما رہے ہیں اور ہمارے دوست بار بار کہتے ہیں۔ "جی "یعنی "جی" سے گویا ان کے فقروں میں فُل سٹاپ لگاتے جاتے ہیں۔ جب کسی سائنس دان کے تجربوں کا ذکر ہوتا ہے تو یہ "جی" کے ساتھ "کمال ہے "کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد بزرگ اپنی ریسرچ سُنانے لگتے ہیں جس پر "کمال ہے" اور "اچھا؟" شروع ہو جاتا ہے۔

ان الفاظ سے وہ ان بزرگ کو صاف ٹرخا جاتے ہیں اور ان سے اتنے قریب رہ کر بھی اتنی دور رہتے ہیں۔

ہمیں صرف وہ تکیہ کلام ناگوار معلوم ہوتا ہے جو کانوں کو ناگوار معلوم ہو۔ مثلاً کئی حضرات کا تکیہ کلام کم بخت یا گدھا یا اُلّو ہوتا ہے۔ بعض حضرات تو اس سے تجاوز کر کے گالیوں تک جا پہنچتے ہیں۔

ایسے حضرات کا علاج ہم بتائیں۔ فرض کیجئے کہ ان کا تکیہ کلام ہے "کم بخت"۔ وہ آپ سے باتیں کر رہے ہیں، فرماتے ہیں۔ "یہ کم بخت نوکر کہاں جا مرا، دن بدن

بگڑتا جا رہا ہے۔ کم بخت۔ اور یہ گھر والے کم بخت بھی ایسے کم بخت ہیں کہ نوکروں کو بالکل ڈھیل دے رکھی ہے کہ جو چاہیں کریں۔ کیا بجا ہو گا اس وقت؟ یہ کم بخت گھڑی بھی بند ہے۔"

آپ جواب دیجئے۔ "مجھے افسوس ہے کہ کم بخت میری گھڑی ایک بد بخت گھڑی ساز کے ہاں عرصے سے پڑی ہے لیکن میں نے ابھی ایک کم بخت گھڑیال کی کمبخت آواز سُنی تھی۔ شاید کم بخت چار بجے تھے۔"

اس کے بعد وہ یقیناً محتاط ہو جائیں گے اور اگر آپ نے کئی مرتبہ اس طرح ان کا تعاقب کیا تو شاید ان کا تکیہ کلام بدل جائے۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ تکیہ کلام نہایت مفید چیز ہے اور ہمیشہ اَڑے آتی ہے۔

لیکن یہ احتیاط رہے کہ کہیں اس کی عادت نہ پڑ جائے۔

شیطان کی خالہ جان

شیطان چوری چھپے ڈاکٹر صاحب کو لے آئے۔ گھر میں مریضوں کی پلٹن تیار تھی۔ معائنہ شروع ہوا۔ ہسپتال کا لطف آ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب تھک جاتے تو کرسی پر ِگر پڑتے۔ تھوڑی دیر سانس لے کر پھر معائنہ شروع کر دیتے۔ ابھی ایک بچّہ باقی تھا کہ شیطان کی خالہ جان آ گئیں۔ انہوں نے اس دلکش اور روح پرور نظارے سے لطف اندوز ہونے کی بجائے یوں ظاہر کیا جیسے انہیں بُرا معلوم ہو رہا ہو۔ڈاکٹر صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد شیطان نے نسخوں کا پلندہ اپنی خالہ کے حوالے کیا۔ انہوں نے پہلے تو ناک بھوں چڑھائی، پھر مریضوں کا مکرّر معائنہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مریض اس معائنہ نمبر دو کے لیے ہر گز تیار نہیں تھے۔ وہ منتشر ہو چکے تھے۔ کوئی چھلانگیں لگا رہا تھا۔ کوئی درخت پر چڑھا بیٹھا تھا۔ چند فٹ بال کھیل رہے تھے۔ ان سب کو دوبارہ گھیر اگیا اور قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ شیطان کی خالہ جان نے ملاحظہ شروع کیا۔ ”ارے ننّھے تجھے کیا ہو گیا؟ دیکھوں تیرے کان (خادمہ سے مخاطب ہو کر) بنّو تھوڑے سے بنولے گُلقند میں ملا کر اسے دینا۔“

شیطان بات کاٹ کر بولے۔ ”بنو لے! باقاعدہ بھُس کے ساتھ ملا کر نہ دیئے جائیں؟“

انہوں نے دوسرے مریض کو دیکھا اور کہا۔ ”اس کی ناک کو سردی لگ گئی ہے۔ اسے تربوز کے بیج، پیپل کی چھال میں پیس کر گاؤزبان کے ساتھ چٹا دو۔“

”گاؤزبان کی جگہ بھینس زبان کو کیوں نہ استعمال کیا جائے؟“ شیطان نے پھر پوچھا۔

”اور تو تو اچھا بھلا تھا۔ بنّو اس کے لیے گل بنفشہ، ہلدی کی گرہ، کیلے کے بیج اور املتاس کی جڑ۔!“

”کیا فرمایا آپ نے؟ فساد کی جڑ؟“ شیطان نے پوچھا۔

”لڑکے تو چپ رہ! ہاں بنّو تو املتاس کی جڑ۔ ان سب چیزوں کو میٹھی میٹھی آنچ میں پکا کر پلٹس بنا کر باندھ دیجو۔“

اتنے میں شیطان نے چھینک ماری۔

”کیا تجھے بھی ٹھنڈ لگ گئی؟ دیکھوں تیرا حلق۔“

شیطان نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن کچھ نہ بنا۔ شیطان کا حلق دیکھا گیا اور یہ نسخہ تجویز ہوا کہ جائفل اور اِملی کو عرق گلاب میں پیس کر تھوڑی سی پیاز اور مولی ملائی جائے۔ اس کے بعد سب کو کپڑے میں چھان کر امرود کے چھلکے اور ذرا سی راکھ کا اضافہ کیا جائے۔ اور خوب گرم کر کے یہ سب اُبلتی اُبلتی شیطان کے گلے پر باندھی جائے اور سونے سے پہلے شیطان ڈیڑھ سیر کا جوشاندہ نوش فرمائیں۔ علی الصبح انکی ٹھنڈر رفع ہو جائے گی۔

اَب شیطان بہت سٹپٹائے۔ بولے۔ ''خالہ جان! کچھ ہُدہُد کے پَر، اُلّو کی دُم اود بلاؤ کی مونچھیں اور کتّے کے کان لے کر خوب پیسے جائیں اور گلے باندھ دیئے جائیں۔''

''لڑکے مذاق اڑاتا ہے؟'' وہ بولیں۔ ''تجھے کیا معلوم؟ یہ ٹوٹکے ہیں اور کبھی خطا نہیں جاتے، نہ جانے تجھے دیسی علاج سے چِڑ کیوں ہے۔ پرسوں جب حکیم احمد غازی نے کھانسی کی دوا بھیجی، وہ بھی تو نے نہیں پی!''

''اس خیال سے نہیں پی کہ وہ خود تو ماشاء اللہ غازی ہیں کہیں ہمیں شہید نہ کر دیں۔ خالہ جان جوشاندے کی جگہ تو ناریل کا تیل پلا دیجئے۔ تھوڑی سی بھنگ یا چرس ملا کر۔''

لیکن ایک نہ سُنی گئی اور شیطان کو لِٹالِٹا دیا گیا۔ جب یہ آپریشن ختم ہوا اور شیطان کے گلے پر سب کچھ باندھ دیا گیا تو وہ بولے۔ ”یار یہاں تو بیمار ہونے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ یہ ایسی جگہ ہرگز نہیں ہے جہاں انسان خوب اطمینان سے بیمار ہو سکے اور جتنی دیر چاہے بیمار رہے۔“

”کیا خوب! تو جناب روفی صاحب یہاں بیمار ہونے تشریف لائے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”ہم؟“ شیطان نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ہم کمان کے تیر ہیں ایک مرتبہ نکل جائیں تو واپس نہیں لوٹتے۔“

ہوا یوں کہ میں دلّی کے اسٹیشن پر یوں ہی گھوم رہا تھا۔ اتنے میں ایک گاڑی کہیں سے آکر رُکی اور شیطان نازل ہوئے۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔ بولے، آگرہ چلو۔ ان دنوں آگرہ میں شیطان کے خالہ اور خالو رہتے تھے۔ میں نے بہانے پیش کئے اور شیطان نے پلیٹ فارم پر باقاعدہ کشتی شروع کر دی۔ جب اسٹیشن پر ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تب میں نے مجبوراً ہاں کی۔ معلوم ہوا کہ آپ دارجیلنگ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے دارجیلنگ اور آس پاس کے علاقے کا کتابوں سے خوب مطالعہ کیا ہے۔ پہاڑ کے لیے وہ اتنے گرم کپڑے ساتھ لائے ہیں کہ کئی حضرات کے لیے کافی ہوں گے۔ ساتھ پہاڑی جوتے، کیمرہ، تھرماس،

برساتی، چھڑی وغیرہ سب لوازمات ہیں لیکن صرف ایک چیز کی کسر ہے، وہ یہ ہے کہ روپے نہیں ہیں۔

میرا بٹوہ نکلا، روپے گنے گئے۔ ایک سو کچھ تھے۔ کئی سالوں کے بعد یہ شُبھ گھڑی آئی تھی کہ میری بٹوے سے روپے برآمد ہوئے۔ شیطان کے روپے بھی ملائے گئے۔ ایک کاغذ پر ہندسے لکھ کر میزان کیا گیا۔ جواب ڈیڑھ سو کے لگ بھگ نکلا۔

"اب صرف ڈھائی سو روپے کی کمی ہے۔" شیطان بولے۔

"اگر محض ڈھائی سو روپے کی حقیر رقم کی کمی ہے تو آگرہ کیوں جارہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"خالہ جان سے روپے لینے۔ بلکہ روپے اینٹھنے۔" وہ بولے۔

واقعی تجویز نامعقول تھی۔

آگرہ پہنچے۔ بڑی دھوم دھام سے ہمارا استقبال ہوا۔ شیطان نے میرا تعارف کرایا۔ تعارف کراتے وقت یہ فقرہ ضرور کہتے۔ "یہ صاحب دوپہر کا کھانا نہیں کھاتے۔" واقعی میں کئی سال سے لنچ نہیں کھاتا۔ لیکن شیطان نے تو باقاعدہ اشتہار بازی شروع کر دی۔ آخر تنگ آکر پوچھا کہ یہ کیا لغویت ہے؟ بولے "پھر

بھی بتا دینا اچھا ہے، خصوصاً لڑکیوں کو۔ کیونکہ وہ اس شخص کو بھی پسند نہیں کریں گی جو لنچ نہ کھاتا ہو۔ کم از کم اسے شوہر کے روپ میں تو ہرگز نہیں دیکھ سکتیں کہ دوپہر کا وقت ہے اور بیگم صاحبہ اکیلی بیٹھی کھانا کھا رہی ہیں۔"

"لیکن شوہر بننا کون مسخرا چاہتا ہے۔ اور پھر تم تو ہر شخص سے کہہ دیتے ہو۔ کل تم نے حجام سے بھی کہا، بجلی کے مستری، ڈاکیے اور شوفر سے بھی۔"

"آئندہ خیال رکھیں گے۔"

شیطان نے وہاں عجب دھما چوکڑی مچائی۔ ایک لمبا چوڑا کتّا نہ جانے کہاں سے پکڑ لائے (شیطان کو لمبے چوڑے کتّے نہایت پسند ہیں) جو کتّا کم اور گدھا زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ شیطان کے خالو اور خالہ دونوں کو کتّوں کا بے حد شوق تھا۔ ان کے ہاں تقریباً ہر سائز اور ہر نمبر کے کتّے موجود تھے۔

شیطان کے کتّے اور ان کتّوں کے خیالات مختلف تھے۔ چنانچہ ہر روز رائے میں اختلاف رہنے لگا۔ پہلے بحث مباحثے ہوتے، پھر باقاعدہ جنگ و جدل تک نوبت پہنچی۔

اُدھر شیطان نے بات بات پر سب کا مذاق اُڑانا شروع کر دیا۔ بچّوں سے بھی مذاق، بڑوں سے بھی، بزرگوں سے بھی۔ میں نے سمجھایا کہ مولانا اس طرح تم

ڈھائی سو روپے کیا ڈھائی روپے بھی نہیں اینٹھ سکتے۔ لیکن شیطان شاید اپنی عادت سے مجبور تھے۔ وہ دونوں کانوں سُنتے اور فوراً دونوں کانوں نکال دیتے۔

میں دارجیلنگ ہو آیا تھا۔ شیطان رات کو سونے سے پہلے وہاں کی آب و ہوا، باشندے، پیداوار، ذرائع آمدورفت وغیرہ پر گفتگو کرتے۔ ٹائیگر ہل سے طلوعِ آفتاب کے نظارے کا ضرور ذکر ہوتا۔ ان کی فرمائش ہوتی کہ اس نظارے کو مفصّل طور پر بیان کرو۔

میں شروع کرتا۔ ”ٹائیگر ہل کے چاروں طرف نہایت اونچے اونچے برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ہیں۔ سورج نکلنے سے پہلے شفق پھوٹتی ہے اور برف پر طرح طرح کے رنگ جگمگاتے ہیں۔ رنگوں کا یہ کھیل کنچن چنگا پر سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس کے بعد سورج طلوع ہوتا ہے۔ سُرخ رنگ کی ایک بڑی ساری گیند گھومتی ہوئی یکلخت برف سے باہر نکل آتی ہے۔ تب مونٹ ایورسٹ نظر آتی ہے۔ دنیا کی سب سے اونچی چوٹی!“

”بس بس! اس سے زیادہ سُننے کی تاب نہیں۔“ شیطان کہتے۔ ”ورنہ نیند نہیں آئے گی۔ اب تو بس یہی تمنّا ہے کہ دارجیلنگ جاؤں؟ مونٹ ایورسٹ اور کنچن چنگا دیکھوں اور بھلا چنگا واپس آ جاؤں۔ بھلا گاڑی کتنے بجے وہاں پہنچتی ہے؟“

"سلی گری سے دو گاڑیاں چلتی ہیں۔ ایک تو دو بجے دوپہر کو پہنچتی ہے اور ایک شام کو۔ موٹریں بھی جاتی ہیں۔"

"تمہارے خیال میں کون سی گاڑی بہتر ہو گی؟ دوپہر والی یا شام والی؟"

"شام والی بہتر ہو گی۔"

"نہیں دوپہر والی سے چلیں گے۔ شام والی اگر لیٹ ہو گئی یا راستے میں بگڑ گئی تو راستے ہی میں منجمد ہو جائیں گے۔"

"لیکن وہ گاڑیاں لیٹ نہیں ہو تیں۔ دارجیلنگ ہمالیہ ریلوے کی ہلکی پھلکی ریل ہے اور اس کے انجن بڑے طاقتور ہیں۔"

"جی نہیں! ہم تو دوپہر کی گاڑی سے چلیں گے۔"

"لیکن ناشتہ!"

"ہر گز نہیں۔ ہم نے ایک بار کہہ جو دیا کہ۔۔۔۔!"

غرضیکہ خوب جھگڑا ہوتا۔ میں تنگ آ کر کہتا۔ "بھئی اس بحث کا فائدہ؟ حالات تو ایسے ہیں کہ ہم دارجیلنگ صرف پیدل جا سکتے ہیں یا پھر واپس چلیں۔"

"ہم!" شیطان اپنے سینے پر تھپڑ مار کر کہتے۔ "ہم کمان کے تیر ہیں۔ ایک مرتبہ نکل جائیں تو واپس نہیں لوٹتے۔"

ہم اسٹیشن سے واپس آ رہے تھے۔ شیطان چونک کر بولے کہ ننھا رو رہا ہے، حالانکہ صاف انجن کی سیٹی تھی اور گھر بھی دو ڈھائی میل تھا۔ ویسے ننھا روتا خوب تھا۔

راستے بھر شیطان کو یہی وہم رہا۔ گھر پہنچ کر دیکھا تو واقعی ننھا رو رہا تھا۔

"آج تو ننّھے نے ہونے میں اپنا گزشتہ بہترین ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ اس کی آواز ہوا کے رُخ کے خلاف ڈھائی میل تک سُنائی دے رہی تھی۔ تعجّب ہے کہ لوگ بچّوں کی نمائش میں رونے کا مقابلہ کیوں نہیں رکھتے۔ اگر رکھیں تو انہیں آل انڈیا چمپئین ہم مہیّا کر سکتے ہیں۔" شیطان نے بتایا۔

"آج کچھ زیادہ ہی رو رہا ہے۔" ان کی خالہ بولیں۔ "بنّو اس وقت نیم کے پتے، اجوائن اور پودینے کو سونف کے پانی میں اُبال کر لے آ۔"

"میرے دانت میں بھی درد ہو رہا ہے خالہ جان!" شیطان شرارتاً بولے۔ "کئی سال سے ہے۔"

"اچھا؟ تو کہیں سے گدھے کی داڑھ مل سکے تو۔۔۔۔۔!"

"گدھے کی داڑھ؟ اپنی داڑھ تڑوا کر گدھے کی داڑھ فٹ کرا لوں؟" شیطان بولے۔ "یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

"پہلے سُن تو لیا کرو۔ گدھے کی داڑھ کو شربتِ بادام میں اُبال کر اسپغول کے چھلکے اور کالی مرچ پیس کر!"

"خالہ جان جائفل میں ایک شامی کباب ملا کر نہ چکھ لوں؟ یا گاؤزبان میں تھوڑی سی بالائی اور ربڑی ملا کر چاٹ لوں۔"

"میں کہتی ہوں تو نے ٹوٹکوں کو سمجھ کیا رکھا ہے؟ لیے پھرتا ہے اپنی ڈاکٹری۔" وہ خفا ہو کر بولیں۔ پچھلے سال ننھا بیمار ہوا۔ ڈاکٹر بولے نمونیہ ہے اور لگے الٹی سیدھی دوائیاں تجویز کرنے۔ میں نے ادرک کا مربّہ، کیکر کا چھلکا، تھوڑی لال مرچ پیس کر شربتِ صندل میں ملا کر پلا دیا۔ اگلے روز نمونیہ تھانہ ہار مونیم۔ ننھا بالکل تندرست ہو گیا۔ اس لڑکی کے گلے بڑھ گئے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ آپریشن ہو گا۔ سب تیاریاں ہو گئیں۔ دو روز میرے کہنے پر بڑ کی کونپل، کنول کی جڑ اور

لہسن کی پٹی باندھی گئی۔ زیرہ، ہڑ راور لونگ پیس کر یہ سفوف عرقِ گاؤزبان کے ساتھ کھلایا گیا۔ لڑکی کے گلے ایسے غائب ہوئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔"

انہوں نے بے شمار مثالیں دے ڈالیں۔

اتنے میں کتّوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ غالباً شیطان کا کتّا دوسرے کتّوں سے تبادلۂ خیالات کر رہا تھا۔ ہم بھاگے، بڑی مشکل سے شیطان کے کتّے کو پکڑا اور اسے باندھ بوندھ کر ایک طرف کیا۔ شیطان کے خالو بھی وہیں تھے۔ باتیں ہونے لگیں۔

"خالو جان آپ کے کتّوں کی صحت اچھی نہیں ہے۔ سب کے سب دمہ۔ اختلاجِ قلب اور مالیخولیا کے مریض معلوم ہوتے ہیں۔" شیطان بولے۔

"اور وہ السیشن کتّا نہیں دیکھا تم نے؟" انہوں نے بڑے فخر سے کہا۔

"وہی کتّا جو گیدڑ سے ملتا ہے؟ وہ تو بیچارہ تپِ دق کا مارا ہوا ہے۔"

"اور وہ جو دو فاکس ٹیریئر ہیں۔ وہسکی اور سوڈا۔۔۔۔ وہ کیسے ہیں؟ دوڑ میں وہ دنیا بھر کے کتّوں کو پیچھے چھوڑ جائیں۔"

"خالو جان معاف فرمایئے۔ دونوں کتّے سخت پوستی اور افیمی قسم کے ہیں۔ ان کے نام وہسکی اور سوڈا کی بجائے تاڑی اور ٹھرّا ہونے چاہئیں۔ میرے خیال میں تو یہ ایک انچ بھی نہیں روڑ سکتے۔"

"تو تمہارا کتّا کون سا تیس مار خان ہے۔ بالکل اجڈ اور جاہل کتّا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"تو لڑا لیجئے۔" شیطان بولے۔ یہ ان کا محبوب فقرہ تھا۔ کتّوں پر جب بحث ہوتی تو یہ فقرہ ضرور آتا۔

"بھائی جان کا کتّا خوب سفید رنگ کا ہے۔" ایک بچّہ بولا۔

"ہر روز صبح اُٹھ کر اسے غسل کراتا ہوں۔ اس کے بعد اس کی دم اور کانوں پر استری کی جاتی ہے۔"

"اور سردیوں میں؟" بچّے نے بڑے شوق سے پوچھا۔ "سردیوں میں تو کتّا ہرگز نہیں نہاتا ہوگا۔"

"سردیوں میں کتّا ڈرائی کلین کرایا جاتا ہے۔"

"بھئی میرے خیال میں تو تمہارا کتّا بالکل ادنیٰ قسم کا ہے۔ جب کبھی یہ مجھے ملتا ہے تو دانت بھی دکھاتا ہے اور دُم بھی ہلاتا ہے۔ یعنی ایک ہی وقت میں خفگی کا اظہار بھی کرتا ہے اور مسرت کا بھی۔ نہایت ہی نامعقول کتّا ہے۔" وہ بولے۔

"تو لڑا لیجئے اپنے بہترین کتّے سے۔ ابھی فیصلہ ہو جائے گا۔" شیطان نے کہا۔

ذرا سی دیر میں کتّوں کے میچ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سارا کُنبہ اکٹھا ہو گیا۔

میں بالکل بیزار تھا۔ نہ مجھے کتّے پسند ہیں، نہ باقی کے جانور۔ مجھے یہ کتّے، بلّیاں، بندر وغیرہ سب فضول لگتے ہیں۔ جنگل کے جانوروں کو نہ جانے انسانوں نے کیوں سر پر چڑھا رکھا ہے۔ کہتے ہیں کتّا انسان کا دوست ہے۔ میرے خیال میں انسان کا بہترین دوست وہ خود ہے۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ تنہائی میں اگر کتّا ساتھ ہو تو انسان جمود سے تنگ نہیں آتا۔ لیکن جو تنگ آنے والے ہوں وہ باتیں کرتے کرتے بھی تنگ آ جائیں گے، رفاقت سے بھی تنگ آ جائیں گے۔

کتّوں کی فلمیں بنائی گئی ہیں۔ کتّوں کے نام رکھے جاتے ہیں۔ کم از کم میرے لیے تو سب کتّے بھونکنے والے کتّے ہیں۔ اور میں ایک کو دوسرے سے نہیں پہچان سکتا جب تک کہ رنگ یا قد کا کوئی نمایاں فرق نہ ہو۔

دوسرے کمرے میں ایک کتّے نے صدائے احتجاج بلند کی اور زبردست نعرہ لگایا۔ "یہ کون مار رہا ہے اس کتّے کو۔" شیطان کے خالو پکارے۔

"دیکھ لیجئے خالو جان! منا لیجئے اپنے کتّے کو۔ خواہ مخواہ اس نے اپنی تھوتھنی میرے پاؤں میں ہے ماری۔" شیطان بولے اور اپنا کتّا لے کر میدان میں آ پہنچے۔ اُدھر ان کے خالو جان کا چمپئین کتّا اپنے حمایتیوں کے ساتھ پہنچا۔ شیطان نے اصرار کیا کہ فالتو کتّوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا جائے چنانچہ ان کو باہر نکال دیا۔

"وہ بھائی جان کہاں گئے؟" ایک بچّے نے ڈر کر پوچھا۔ "جو آپ کے ساتھ آئے ہیں۔"

"کیا وہی جو دوپہر کا کھانا نہیں کھاتے؟" شیطان بولے۔

"جی ہاں!"

"وہ اس کونے میں بیٹھے ہیں۔" اور بچّہ میرے پاس آ بیٹھا۔ غالباً اسے بھی کتّوں سے سخت نفرت تھی۔ کتّوں کی لڑائی شروع ہوئی۔ پہلے راؤنڈ میں دونوں کتّے برابر رہے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے معانقہ کیا اور دور دور سے ناک بھوں چڑھاتے رہے۔ دوسرے راؤنڈ میں گتھم گتھا ہو گئے۔ شیطان کا بُرا حال تھا۔ چلّا چلّا کر اپنے کتّے کو مشورے دے رہے تھے۔ "شاباش! ڈاگی (یہ کتّے کا نام تھا)

ہاں اسی طرح ایک لیفٹ ہک اور لگاؤ۔ پیچھے ہٹو، وہ اس کا سٹریٹ لیفٹ آرہا ہے۔ غوطہ دے جاؤ۔ بس ایک زور کا پنچ اور لگے۔ یوں نہیں! مدافعت کرو۔ غصّہ مت کرو۔ پہلے تھکالو پھر ناک آؤٹ کرنا۔"

"بھئی یہ بات غلط ہے۔ تم بتاتے کیوں ہو؟" ان کے خالو بولے۔

"آپ بھی بتایئے! ہاں توڈاگی ایک اَپر کٹ لگاؤ۔ پیچھے مت ہٹو۔ اب ایک رائٹ ہُک لگے۔ کیا کہنے ہیں؟ نزدیک سے ایک اور پنچ دو۔ ایک ہُک اور۔۔۔۔۔ واہ رے میرے ڈاگی! ناک سے سانس لو ورنہ ہانپنے لگوگے۔ شاباش!"

چوتھے راؤنڈ میں ڈاگی نے اپنے مخالف کو ناک آؤٹ کر دیا اور سنبھلتے ہی وہ اس بُری طرح میدان سے بھاگا کہ وہ دو دیواریں کود گیا۔

شیطان نے ڈاگی کا دھنا پنجہ ہوا میں ہلا کر کہا۔ "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! دی ونر۔"

ان کے خالو بولے۔ "میں اسے ہرگز لڑائی نہیں کہتا۔ تم نے سراسر بے ایمانی کی ہے۔ اپنے کتّے کو بتایا کیوں؟ تمہارے کتّے کو مقابلے سے خارج کیا جاتا ہے۔"

ایک طویل بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ دونوں کتّے برابر رہے۔

کچھ دیر کے بعد ہارا ہوا کتّا واپس لایا گیا اور اس کی مرہم پٹی شروع ہوئی۔ شیطان کی خالہ بولیں۔ ”ٹنکچر ونکچر مت لگاؤ۔ نیلا تھوتھا، چنبیلی کے پھول، الائچی اور گُڑ کو رگڑ کر باندھ دو۔“

”اس کتّے کو تارپین کا تیل پلا دو۔“ شیطان بولے۔ ”فوراً چاک و چوبند ہو جائے گا۔“

لیکن ان کی خالہ جان کے ٹوٹکے پر عمل کیا گیا۔

شیطان نے خانساماں سے پوچھا۔ ”آج کیا پکا ہے؟“ وہ بولا۔ ”قیمہ۔۔۔ کڑھی اور آئس کریم۔“

”آج پھر پکا دی تم نے آئس کریم؟ کل تو پکی ہی تھی۔“ شیطان بولے۔ ”تم بھی بس پورے کڑھی بگاڑ ہو۔“

اتنے میں ننھا میرا ہیٹ لے آیا۔ ”بھائی جان آپ کا یہ ہیٹ باہر ایک گڑھے میں پڑا تھا۔“ اور شیطان نے میری طرف مُسکرا کر دیکھا۔

اس کم بخت ہیٹ سے میں عاجز آ چکا تھا۔ آتے وقت ریل میں میرا ہیٹ کھویا گیا اور دلّی میں مَیں نے نیا خریدا۔ جلدی میں سائز وغیرہ کا خیال نہیں کیا۔ بعد میں

جب پہن کر دیکھا تو بہت بڑا تھا۔ تبھی ہمیشہ اسے ہاتھ میں رکھتا، سر پر کبھی نہ پہنتا۔

شیطان نے ہیٹ کو ہوائی جہاز کا خطاب دیا۔ اسے دیکھتے ہی کہتے۔ "یار یہ ہیٹ ہے یا ہوائی جہاز۔" ایک ہیٹ کو ہوائی جہاز سے کیا مشابہت ہو سکتی ہے؟ یہ ایک راز تھا جو شیطان تک محدود تھا۔ آگرہ پہنچ کر میں نے ہر ممکن طریقے سے وہ ہیٹ ضائع کرنا چاہا۔ جہاں جاتا اسے جان بوجھ کر بھول جاتا۔ اِدھر اُدھر چھُپا دیتا۔ پھینک دیتا۔ لیکن کوئی نہ کوئی لا کر واپس دے دیتا۔ اب شیطان ہیٹ کا خاص خیال رکھنے لگے اور باقاعدہ اس کے نگہبان و سرپرست مقرر ہوئے۔ رات ہوا تیز تھی۔ میں نے چھت سے نیچے پھینک دیا۔ سوچا کہ اُڑ کر کہیں چلا جائے گا لیکن ننّھے میاں کہیں سے ڈھونڈ لائے۔

دارجیلنگ کے متعلق پھر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہہ دیا۔ "روفی! اس طرح تو تم ہرگز وہاں نہیں جاسکتے۔ ایک تو تم نے خالہ جان سے اس بات کا اب تک ذکر نہیں کیا۔ دوسرے یہ کہ تم ہر بات میں ان سے الجھ پڑتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں بزرگ تمہیں پسند نہیں کرتے۔"

"ذکر تو کیا تھا لیکن وہ بولیں تمہاری امّی نے لکھا ہے کہ روفی یہاں سے کافی روپے لے کر نکلا ہے۔ خدا جانے کہاں جائے گا۔ اگر تمہارے پاس آئے تو تم اسے اور روپے مت دینا۔"

"تو کیا واقعی تم بہت سے روپے لے کر نکلے تھے؟"

"ہاں! لیکن یک لخت تھوڑے سے رہ گئے۔ خالہ جان کے سامنے میں نے قسم بھی کھائی کہ میرے پاس ایک پیسہ نہیں ہے۔"

"جھوٹی قسم کھالی؟"

"نہیں بھئی! ایک پیسہ کہاں ہے میرے پاس۔ روپے اور آنے ہیں۔ لیکن انہوں نے نہ تو روپے دینے کا وعدہ کیا ہے نہ باقاعدہ انکار ہی ہوا ہے۔"

"تو پھر چلو واپس چلتے ہیں۔"

"ہم!" شیطان اپنی چھاتی پر مکّہ مار کر بولے۔ "ہم کمان کے تیر ہیں، ایک مرتبہ نکل جائیں تو کبھی واپس نہیں آتے۔"

اگلے روز اتوار تھا۔ علی الصبح ایک قافلہ تاج محل کی طرف روانہ ہوا۔ قافلے میں شیطان کے خالو کا کُنبہ تھا۔ دو ایک اور کُنبے اور تھے۔ دن بھر کا راشن ساتھ تھا۔

شیطان کے خالو بہت اچھے موڈ میں تھے۔ ایک پلاٹ میں ہم تینوں بیٹھے چلغوزوں سے شغل کر رہے تھے۔ شیطان کے خالو اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔

"گھاس پر ابھی تک شبنم ہے۔ شبنم تو تم جانتے ہی ہو صبح بھی پڑتی ہے اور بعض اوقات سہ پہر کو بھی۔ سہ پہر آج کل کافی گرم ہوتا ہے۔ پنکھے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پنکھے بھی دن بدن مہنگے ہوتے جا رہے ہیں۔ بازار میں ملتے ہی نہیں۔ بازار میں تو تم جانتے ہی ہو کہ قیامت بپا ہے۔ سبزیاں غائب ہو چکی ہیں۔ اگر کہیں ہیں تو سونے کے تول ملتی ہیں۔ سبزیاں صحت کے لیے نہایت مفید ہیں۔ خصوصاً شلجم۔ شلجم صالح خون پیدا کرتا ہے اور ہاضم بھی ہے۔ تو شلجم (گھاس پر ہاتھ پھیر کر) میں کس چیز کا ذکر کر رہا تھا؟ شلجم کا یا شبنم کا؟"

"جی بُلبُلوں کا۔" شیطان نے لقمہ دیا۔

"ہاں تو بلبلیں بھی خوب ہیں۔ ہماری شاعری میں صبح سے شام تک بلبلیں چہکتی ہیں۔ فلموں میں بھی تم نے بارہا بلبلیں دیکھی ہوں گی۔ یہ فلمیں بھی دن بدن

گرتی جارہی ہیں۔ سنا ہے کہ فلمی گانے دراصل بیک گراؤنڈ میں کوئی اور گاتا ہے اور پردے پر مُنہ ہیرو یا ہیروئن کا ہلتا ہے۔"

"میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ بیک گراؤنڈ میں اسکیٹنگ کوئی اور کرتا ہے لیکن پردے پر کوئی اور دکھایا جاتا ہے۔" شیطان نے کہا۔

"میں نے نہیں سُنا۔ خیر تو فلمیں گرتی جارہی ہیں۔ سینما ہال میں الگ شور مچتا ہے۔ خوانچے والے شہر بھر کی گلیاں کُوچے چھوڑ کر سینما ہال میں آ گھستے ہیں۔ میرے خیال میں وہاں سودا بازار سے اچھا ملتا ہے۔ پرسوں میں نے ہال میں آم خریدے، کافی اچھے تھے۔"

"میں نے بھی خریدے تھے۔ قلمی آم تین آنے فی جِلد تھے۔" شیطان بولے۔

"اصلی آم تو دربھنگے کے ہوتے ہیں۔ دربھنگہ مشرقی ہندوستان میں ہے۔ مشرقی ہندوستان میں بارشیں خوب ہوتی ہیں۔ بارش چراپونجی میں دنیا بھر سے زیادہ ہوتی ہے۔ دنیا نظامِ شمسی میں بہت ہی چھوٹا سیارہ ہے۔ کہتے ہیں کہ نظام، شمسی۔۔۔۔ 'بھلا میں کسی چیز کا ذکر کر رہا تھا؟'"

"امرودوں کا۔" شیطان نے لقمہ دیا۔

"ہاں تو امرود۔۔۔۔"

شیطان کے خالو اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔

شیطان کو خانساماں نظر آ گیا۔ آواز دی۔ ”آئس کریم پک چکی یا نہیں؟“

”تیار ہو رہی ہے۔“ جواب ملا۔

”چلے چلیں۔“ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔

”وہ دروازہ کافی پرانا معلوم ہوتا ہے۔“ انہوں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن جب بنا ہوگا تو بالکل نیا ہوگا۔“ شیطان نے جواب دیا۔

وہاں پہنچ کر دیکھتے ہیں کہ بے شمار خواتین و حضرات جمع ہیں۔ سب کے سب قافلے کے ممبر تھے۔ پہلے شیطان کا تعارف کرایا گیا۔ پھر شیطان نے میرا تعارف کرایا اور ”یہ دوپہر کا کھانا نہیں کھاتے“ والا فقرہ بھی بار بار دہرایا۔

”لیکن آج یہ ضرور کھائیں گے۔“ آوازیں آئیں۔

”بھئی آج ضرور کھانا پڑے گا۔“ شیطان بولے۔ ”اور تمہارا ہیٹ کہاں گیا؟ وہ ہوائی جہاز۔“

”میں ساتھ نہیں لایا۔“

"آپ ساتھ لائے تھے، کہیں چھپا آئے ہیں۔" اور شیطان نے دو تین ننھوں کو ہیٹ تلاش کرنے بھیج دیا۔

اب تاج محل کی تصویریں اُترنے لگیں۔ قافلے والوں کے پاس کئی کیمرے تھے۔

تاج محل کو بیک گراؤنڈ میں لے کر چند خواتین کو بٹھایا گیا اور شیطان کی خالہ اُنکی تصویر اتارنے لگیں۔ شیطان بولے۔ "ٹھہریئے!" اور اپنے خالو کے ہاتھ میں کیمرہ دے کر بولے۔ "جونہی خالہ جان ان کی تصویر اتاریں، آپ خالہ جان سمیت سب کی تصویر کھینچ لیجئے۔" انہوں نے فوکس کیا۔ ایک بزرگ کیمرہ لیے کھڑے تھے۔ شیطان ان کو کھینچ لائے۔ "جب خالو جان ان خواتین کی تصویر اتاریں، آپ ان سب کی تصویر کھینچ لیجئے۔" ان کے لیے بھی فوکس کیا گیا۔

ذرا سی دیر میں ہم مورچہ بندی کھڑے تھے۔ شیطان کی خالہ جان ان خواتین کی تصویر اتارنے کے لئے، شیطان کے خالو شیطان کی خالہ جان کی تصویر کے لیے، وہ بزرگ شیطان کے خالو کی تصویر کے لیے، ایک اور بزرگ اُن بزرگ کے لیے۔ شیطان ان بزرگ کے لیے اور میں نے شیطان کو فوکس کر رکھا تھا۔

”کاش کہ چند کیمرے اور ہوتے۔ اچھا! جب میں تین کہوں تو تصویر لے لیجئے۔“ شیطان بولے۔ ”ایک۔ دو۔ چار! معاف کیجئے!“ اور سب نے تصویریں کھینچ لیں۔

”اچھی نہیں آئیں گی۔ صحیح وقت پر نہیں کھینچی گئیں۔“

اب کھانا شروع ہوا۔ مجھے بھی زبردستی شامل کیا گیا۔

”ابھی ابھی میں نے اس درخت کے پاس ایک سانپ دیکھا۔“ شیطان بولے۔

”سانپ دیکھا؟“ سب چیخ کر بولے۔ ”'زندہ سانپ؟“

”جی ہاں زندہ سانپ۔ بلکہ زندہ ناچتا گاتا سانپ۔“

”تو پھر؟“

”پھر کیا تھا۔ میں نے سانپ دیکھا اور سانپ نے مجھے دیکھا۔“

اتنے میں خانساماں نے شیطان کے خالو سے پوچھا۔ ”صاحب وہ چیز لے آؤں؟“

”ابھی ٹھہرو“ وہ بولے۔

"اس" وہ چیز پر ہم دونوں کے کان کھڑے ہوئے۔ ضرور کوئی نہایت مزیدار چیز ہو گی۔ چنانچہ شیطان نے اپنی رفتار مدھم کر دی۔

"کیوں صاحب یہ تاج محل کا نقشہ موسیٰ خان نے بنایا تھا کیا؟" شیطان نے پوچھا۔

"موسیٰ خان نے نہیں اُستاد عیسیٰ نے بنایا تھا۔" کسی نے جواب دیا۔

"اُستاد کیوں؟ بچّوں کو پڑھاتے تھے کیا؟"

"جی نہیں! وہ تو۔۔۔!"

"تو پھر موسیقی سے لگاؤ رکھتے ہوں گے۔"

"جی نہیں وہ تو بہت بڑے۔۔۔۔"

"تو بڑے اُستاد ہوں گے۔"

"بہت بڑے معمار تھے۔"

خانساماں نے پھر پوچھا۔ "وہ چیز لے آؤں؟"

"ذرا ٹھہرو۔" شیطان کے خالو بولے۔

ہمیں پھر یاد آ گیا اور کھانے کی رفتار بالکل مدھم کر دی۔ بالکل پیدل چل رہے تھے۔

"تاج محل بنانے کے صلے میں شاہجہان نے اسے اُستاد عیسیٰ خان کو خان بہادر کا خطاب ضرور دیا ہو گا۔" شیطان نے کہا۔

ذرا سی دیر میں خانساماں نے پھر پوچھا۔ شیطان کے خالو جھلّا کر بولے۔ "بھئی یہ کیا تم بار بار پوچھتے ہو، جب منگانی ہو گی خود بتا دیں گے۔"

اور شیطان نے کھانا بالکل بند کر دیا۔ اس چیز کا انتظار کرنے لگے۔ آخر خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور شیطان کے خالو بولے۔ "لے آؤ وہ چیز۔"

وہ چیز آئی۔ ہم نے بھی بڑی بے صبری سے ڈونگہ لیا۔ ڈھکنا اٹھا کر دیکھتے ہیں تو دہی تھا جس پر شکر چھڑک رکھی تھی۔ اور شیطان مچل گئے کہ ان کو دھوکے میں کیوں رکھا گیا اور دوبارہ نئے سرے سے کھانا شروع کر دیا۔

کافی دیر میں واپس لوٹے۔ واپسی پر شیطان کہیں کھانس پڑے۔ ان کی خالہ نے فوراً وہیں ایک ٹوٹکا تجویز کر دیا۔ رات کو شیطان کو تقریباً دو تین سیر پختہ جوشاندہ پینا پڑا۔

ہم سب برآمدے میں بیٹھے تھے۔ شیطان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔

"خالہ جان! ایک ناول سناؤں؟" انہوں نے پوچھا۔

"بھئی کافی دیر ہو چکی ہے۔" وہ بولیں۔

"نہایت ہی مختصر ناول ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ایک بانکا ہیرو ایک نہایت ہی بانکے گھوڑے پر سوار ہے اور بڑے بانکپن سے سڑک پر جا رہا ہے۔ ہیرو کے پاس ایک پستول ہے اور ایک چاقو کیونکہ آگے جنگل میں ڈاکو رہتے ہیں۔"

"بھئی اب کل سنیں گے۔ نیند آ رہی ہے۔" ان کے خالو بولے۔

"ایک منٹ اور۔ ہاں تو ہیرو جنگل میں داخل ہوا ہی تھا کہ چاروں طرف سے ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ ڈاکو تعداد میں دس تھے۔ اور سب کے سب مسلّح تھے۔ ہیرو نے فوراً پستول نکال کر فائر کیا۔ جواب میں کئی گولیاں آئیں۔"

"بارہ بجنے والے ہیں۔ صبح جلدی اُٹھنا ہے!"

"ہیرو نے خوب مقابلہ کیا۔ لیکن مخالف کئی تھے۔ آخر ایک گولی ہیرو کے ایسی لگی کہ بیچارے کا وہیں انتقال ہو گیا اور خوش قسمتی سے یہ ناول پہلے ہی باب میں ختم ہو گیا۔۔ بس قصّہ تمام ہوا۔ آپ تو خواہ مخواہ گھبرا رہے تھے۔"

اگلے روز ہم اسٹیشن پر گئے۔ دارجیلنگ جانے کے لیے گاڑیوں کے تازہ ترین اوقات دریافت کرنا چاہتے تھے (ایک روز پہلے بھی دریافت کئے تھے)۔ ایک گاڑی آئی۔ ہم پلیٹ فارم پر چل رہے تھے۔ دفعتاً شیطان کسی کو دیکھ کر چونک پڑے۔ بولے۔ ”خوب تو موچھیں منڈوا دی ہیں حضرت نے۔“ آگے بڑھ کر ایک صاحب سے کہا۔ ”آداب عرض۔“ وہ کچھ جھجکتے، شیطان بولے۔ ”جناب آپ اپنی مونچھوں کے بغیر ہمیں پہچانتے ہی نہیں۔“ اور وہ صاحب قلانچ بھر کر ٹرین سے کود ے اور شیطان سے لپٹ گئے۔ معلوم ہوا کہ شیطان کے پرانے واقف ہیں اور فی الحال کہیں پروفیسر ہیں۔ (شیطان کے پرانے واقف کئی کئی سال سے فارغ التحصیل ہو چکے ہیں اور آج کل ملازم ہیں) ان صاحب سے میرا تعارف کرایا گیا۔

”یہ میرے نہایت ہی عزیز دوست ہیں جو دوپہر کو کھانا نہیں کھاتے۔“ شیطان نے کہا۔

معلوم ہوا کہ وہ دارجیلنگ سے آرہے ہیں۔

بس شیطان تو وہیں بچھ گئے۔ جتنے سوالات دارجیلنگ کے متعلق کوئی ممتحن پوچھ سکتا، شیطان نے پوچھ ڈالے۔ کچھ دیر میں گاڑی چلی گئی۔

ہم دونوں ریفریشمنٹ روم میں بیٹھے۔ چاء پی رہے تھے۔ شیطان بولے۔ ''بھئی اب صبر کا پیمانہ کیا صبر کا گھڑا لبریز ہو چکا ہے۔ لبریز تو عرصے کا ہو چکا تھا۔ لیکن ہر روز میں چھلکا دیا کرتا تھا۔ اگر اسی ہفتے دار جیلنگ نہ گئے تو لعنت ہے۔ یہ کم بخت وہیں سے آ رہا ہے۔''

''ان کے ڈبّے میں بہت بھیڑ تھی۔ آج کل سیکنڈ کلاس میں بھی جگہ نہیں ملتی۔''

''یہ بھیڑ نہیں تھی، یہ اس کے بچّے تھے۔ پوری ٹیم کی ٹیم ہے۔''

''اچھا تو کیا یہ شادی شدہ ہے؟''

''محض شادی شدہ نہیں، بے حد شادی شدہ ہے۔ اس شخص کا قصّہ بھی بڑا درد ناک ہے۔ جب کبھی ہم فورتھ ائیر میں اکٹھے تھے تو ان دِنوں یہ نہایت ہی خوش قسمت تھا۔ سال بھر اس کی قسمت تیز رہی۔ امتحان میں پاس ہوا۔ کھیل میں اچھا رہا۔ تاش میں خوب روپے جیتتا تھا۔ گھڑ دوڑ پر بھی جانے لگا۔''

''دوڑتا تھا کیا؟''

''نہیں! گھوڑوں پر روپے لگاتا تھا۔ کسی کمزور اور بیہودہ سے گھوڑے پر روپے لگا دیتا تو وہ بھی رو پیٹ کر کسی نہ کسی طرح اوّل آ ہی جاتا۔ ہم سب اس پر رشک کرتے تھے۔ اس کی خوش نصیبی مثالی تھی۔ انہی دنوں یہ ایک لڑکی سے محبّت

کرنے لگا۔ لیکن وہ اسے خاطر میں نہ لاتی تھی۔ ایک ہفتے تو اس کی قسمت کا ستارہ ایسا چمکا کہ وہ خود حیران رہ گیا۔ سالانہ امتحان میں اوّل آیا۔ یونیورسٹی ہاکی ٹیم میں لے لیا گیا۔ یونین سیکرٹری بھی بن گیا اور میگزین کا ایڈیٹر بھی۔ گھڑ دوڑ میں پانچ سو روپے جیتے۔ سب نے مشورہ دیا کہ لگے ہاتھوں اظہارِ محبّت بھی کر ڈالو۔ قسمت تیز ہے۔ ممکن ہے وہ لڑکی مان جائے۔ چنانچہ اس نے سب کے کہنے سننے پر اس لڑکی کو مطلع کر دیا کہ اس کا ارادہ خودکُشی کا ہے اور لڑکی کے بغیر اس کی زندگی محال ہے وغیرہ وغیرہ۔ بس! وہ دن اور آج کا دن، اس کی قسمت کا ستارہ ایسا ڈوبا کہ کہیں انتقال ہی کر گیا۔ اس کے بعد یہ امتحان میں فیل ہوا۔ ٹیم سے نکالا گیا۔ تاش میں ہر روز ہارنے لگا۔ گھڑ دوڑ میں اگر بہترین گھوڑے پر روپے لگاتا تو وہ لنگڑانے لگتا یا جیتتا جیتتا ہار جاتا۔ اس کا سارا مسخرہ پن جاتا رہا اور یہ بالکل چڑچڑا بن گیا۔"

"تو کیا اس لڑکی نے اسے ٹھکرا دیا؟"

"جی نہیں! بلکہ اس لڑکی نے اس سے شادی کر لی۔" شیطان بولے۔ "اور تمہارا ہیٹ کہاں ہے؟"

میں نے کہا کہ میں نہیں لایا۔ شیطان فوراً گئے اور پلیٹ فارم پر تلاش کر کے بکسٹال سے ہیٹ اُٹھا لائے جہاں میں اسے بحفاظت بھول آیا تھا۔

"میاں اگر یہ ہوائی جہاز خریدا ہے تو پہنا بھی کرو۔ گلے کا ڈھول بجانا ہی پڑے گا۔" وہ بولے۔

اب شادی پر باتیں ہونے لگیں۔ شیطان نے کہا۔ "میرے خیال میں شادی کی کوئی خاص ضرورت تو ہے نہیں۔ شادی کا خیال بہشت اور دوزخ کے خیال کی طرح ہے۔ اگر کوئی ذکر کرے اور یاد دلائے تبھی یاد آتا ہے ورنہ نہیں۔"

"تم بھی بہروپیے ہو۔ کبھی شادی کے اس قدر معتقد ہو جاتے ہو کہ ہمیں بھی پریشان کر دیتے ہو۔"

"وقت وقت کا راگ ہے۔ اس وقت قطعاً اس قسم کا ارادہ نہیں ہے۔ اس وقت شادی کے متعلق سوچنا ایسا ہی ہے جیسے فتح پور سیکری کے اونچے دروازے سے چھلانگ لگا دینا اور جو وہاں سے چھلانگ لگائے گا یا تو اس کے دماغ میں خلل ہے اور یا وہ لگانا چاہتا ہے۔ یقیناً ایسی چھلانگ صحت کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔"

"کبھی کبھی یہ کیا الٹی سیدھی ہانکنے لگتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ دورہ پڑتا ہے۔"

"تم نے ہی تو ذکر چھیڑا تھا۔ اس وقت شادی سے کہیں اہم اور بلند مقاصد ہمارے سامنے ہیں۔"

"کون سے؟"

"دارجیلنگ جانا اور دنیا کے اہم ترین اور سب سے بلند پہاڑ کی زیارت کرنا۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ خالہ جان سے روپے لینا بھی مونٹ ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچنے سے کم نہیں۔ بلکہ شاید مشکل ہی ہو۔ تمہارا کہنا صحیح ہے۔ وہ کچھ ناراض سی بھی ہیں۔"

"اس خانساماں سے مشورہ نہ لیں۔ کافی عقلمند معلوم ہوتا ہے۔"

"عقل میں کیا ہم کسی سے کم ہیں؟ وہ خانساماں شکل و صورت سے تو گویّا معلوم ہوتا ہے۔ تم ہی بات کرنا۔ مجھ سے تو وہ آئس کریم پکانے کے سلسلے میں چڑِ سا گیا ہے۔"

"اب چلیں؟"

"ہاں چلو اور اپنا ہیٹ ساتھ لے لو۔"

رات کے کھانے پر شیطان کو ہچکیاں آنے لگیں۔ بہتیرا کہا کہ کوئی یاد کر رہا ہے۔ لیکن اسی وقت خالہ جان کی ہدایت کے مطابق ان کو جائفل، لونگ اور منقّا ہرڑ اور اسی قسم کی پندرہ بیس چیزوں کو پیس کر شربتِ عناب کے ساتھ نوش فرمانا پڑا۔ شیطان نے بہت بُرا مُنہ بنایا اور سب کے سامنے اعلان کر دیا کہ ان کا ٹوٹکوں پر ذرا بھی اعتقاد نہیں ہے۔

بڑے کمرے میں ایک کلاک تھا۔ علی الصبح ہم ناشتے کے لیے اس کمرے سے گزرتے تو کلاک میں دس بجے ہوئے ہوتے۔ یہی خیال آتا کہ بہت دیر ہو گئی ہے۔ شیطان وقت دیکھ کر ہر روز کہتے۔ ”آج کل بہت جلد دیر ہو جاتی ہے۔“

”میں نے خانساماں سے پوچھا کہ بھئی یہ کلاک اتنا تیز کیوں ہے کہ صبح صبح دس بجا دیتا ہے۔“ وہ بولا۔ ”صاحب! یہ کلاک مدّتوں سے بند ہے۔ اس میں دو ڈھائی سال سے دس بجے ہوئے ہیں۔“ دو چار باتیں اور ہوئیں اور مجھے پتہ چلا کہ اسے روپے کی سخت ضرورت ہے اور شیطان کے خالو سے مانگنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ ویسے اگر وہ چاہے تو اپنے گھر سے روپے منگا سکتا ہے۔

”تو گھر سے کیوں نہیں منگا لیتے؟“ میں نے مُسکرا کر پوچھا۔

”ایک تو مجھے لکھنا نہیں آتا۔“ وہ مُسکرا کر بولا۔ ”اور دوسرے وہ لوگ پڑھ نہیں سکتے۔“

میں نے اسی روز اسے کچھ روپے دِلوا دیئے۔ ہم دونوں کچھ کچھ دوست بن گئے۔ اب میں نے سب کچھ بتا دیا اور اس کی مدد چاہی۔ اس نے ایک نہایت ہی مخلصانہ

اور لاجواب مشورہ دیا۔ میں نے وہی مخلصانہ اور لاجواب مشورہ شیطان کے حوالے کر دیا اور ساتھ ہی دھمکایا بھی کہ اگر اس مشورے پر بہت جلد عمل نہ ہوا تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ ظاہر ہے کہ اس مشورے کا تعلّق ٹوٹکوں سے تھا۔

اگلے روز میں دوپہر کو شہر کا چکر لگا کر واپس لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھر میں غدّر سا مچا ہوا ہے۔ ایک طرف بچّے قطار باندھے کھڑے ہیں۔ ایک طرف بہت سے پتّے، ٹہنیاں، جڑیں اور تھیلیاں رکھی ہیں۔ شیطان اور ان کی خالہ کھڑے بچّوں کا معائنہ کر رہے ہیں۔

ایک طرف ہاون دستے میں کچھ کوٹا جا رہا ہے۔ دوسری طرف سِل پر کچھ پیسا جا رہا ہے۔ باورچی خانے میں دیگچیاں کھڑک رہی ہیں۔ وہاں کچھ گرم کیا جا رہا ہے۔ کچھ اُبالا جا رہا ہے۔

باری باری پیپل کے پتّے، نیم کی جڑ، گولر کی کونپل، امرود کے بیج، نوشادر، سونف، گاؤزبان، دار چینی اور اسی قسم کے نام سنائی دیتے ہیں۔ کبھی شیطان خود کچھ پھانک جاتے ہیں۔ کبھی ان کی خالہ جان کچھ چبانے لگتی ہیں۔ کبھی کسی بچّے کے حق میں کچھ انڈیل دیا جاتا ہے۔

مجھے دیکھتے ہی شیطان چلّائے۔ ''ارے یہ تم بیزار سے کیوں ہو؟'' نبض دیکھی اور بنّو سے بولے۔ ''کچھ ادرک، پودینے کے چند پتّے، تربوز کے بیج، انار کے چھلکے اور زعفران کو شربت انناس میں ملا کر پلا دو۔''

پیشتر اس کے کہ میں کچھ بولتا، ایک نہایت ہی بد مزہ اور کسیلی دوائی میرے مُنہ میں اُلٹ دی گئی۔ وہاں سے بھاگ کر کمرے میں پہنچا۔ کوٹنے، پیسنے، چھاننے اور ابالنے کی آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔ کچھ دیر بیٹھا رہا۔ پھر اونگھنے لگا۔ سہ پہر کے قریب آنکھ کھلی۔ دیکھا کہ شیطان مجھے جھنجھوڑ رہے ہیں۔ چہرے پر ایک خاص شیطانی مسکراہٹ ہے۔

''تیار ہو جاؤ، فوراً سامان وغیرہ۔۔۔۔''

''کیا ہوا؟''

''آج سے تمہارے اس ہیٹ کو بھی چھٹی دی جاتی ہے۔'' انہوں نے ہیٹ اٹھا کر باہر پھینک دیا۔

''آخر ہوا کیا؟'' میں نے دوبارہ پوچھا۔

''ٹوٹکے۔ ٹوٹکے! اچھا یہ تو بتاؤ کہ اس وقت ہمیں کون سی گاڑی مل سکتی ہے؟''

”خدا کے لیے کچھ کہو تو سہی کہ کیا ہوا؟“

”بس تم فوراً تیار ہو جاؤ!“ شیطان بٹوہ دکھا کر بولے۔

”کس طرف چلیں گے؟ واپس؟؟؟“

”ہم“ شیطان اپنا سینہ بے تحاشا کوٹتے ہوئے بولے۔ ”ہم کمان کے تیر ہیں۔ ایک دفعہ نکل جائیں تو پھر واپس نہیں لوٹتے۔“